MAY
2022

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

عید مبارک

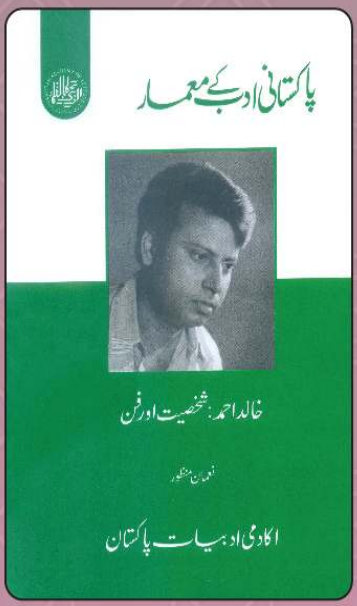
پاکستانی ادب کے معمار
خالد احمد: شخصیت اور فن
نعمان منظور
اکادمی ادبیات پاکستان

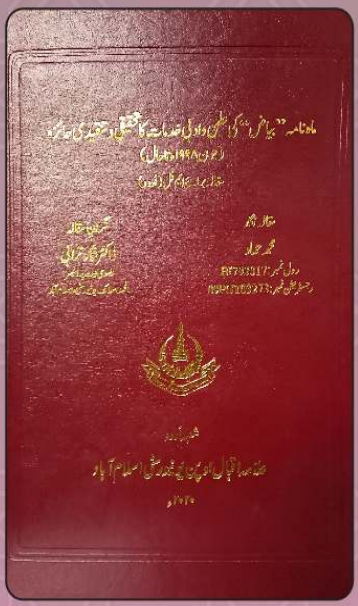
ماہنامہ "بیاض" کی علمی و ادبی خدمات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ
(جون ۱۹۹۸ء تا جون ۲۰۱۸ء)
مقالہ نگار
محمد جمال
رول نمبر: BF7-5131/17
رجسٹریشن نمبر: 19PH-0102/17
نگرانِ مقالہ
ڈاکٹر شاہد حسرانی
شعبۂ اردو
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد
۲۰۲۰ء

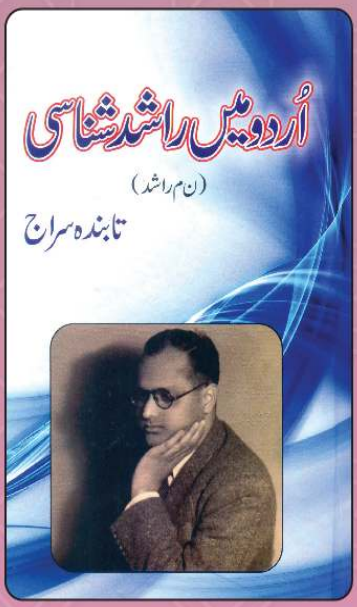
اُردو میں راشد شناسی
(ن م راشد)
تابندہ سراج

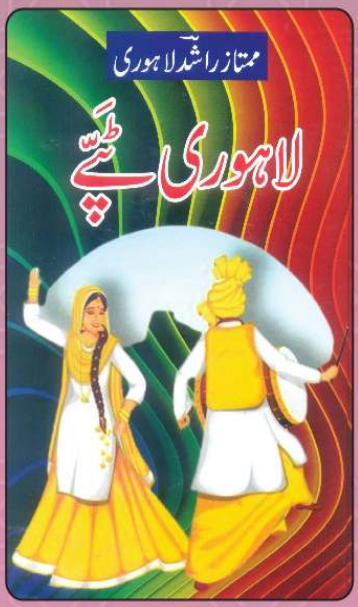
ممتاز راشد لاہوری
لاہوری ٹپے

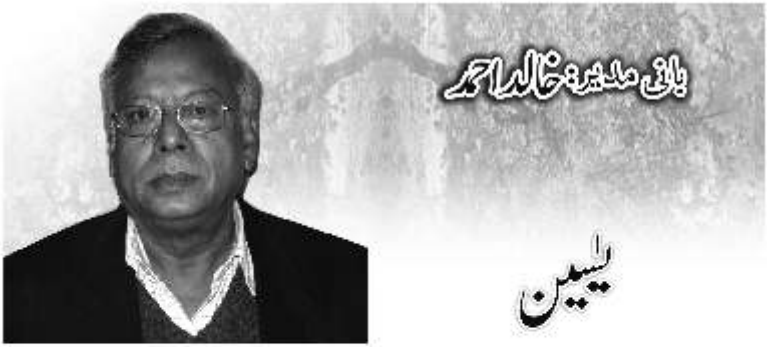

یٰسین

ٹھوڑیوں تک ہیں گردنوں میں طوق
کس اکڑ میں جکڑ دیا تُو نے
سربلند اور سربلند ہوئے
ان جبینوں میں کوئی سجدہ نہیں

تحصیر

لوگ ہوں یا اجرامِ خلائی
صرف اُصولوں کو ہے دَوام
ہر سیّارے کا اِک محور
ہر تارے کا ایک مقام

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL

Freight Forwarding

Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جامعہ تراجم کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC Certified

جلد نمبر: 30 - مئی 2022 - شمارہ نمبر: 5

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: عیدالفطر مبارک

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک $100 پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 92-42-37513000-3 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

محمد منظور ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سرور حسین نقشبندی	7
2	نعت	سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، محمد یٰسین قمر، خاور اعجاز، اختر شمار، اکرم ناصر، محمد انیس انصاری، ریاض رومانی، علی رضا، سرور حسین نقشبندی، اصغر علی بلوچ، سید فرخ رضا ترمذی	8 تا 19
3	عقیدت	سید فخر الدین بلّے، آصف ثاقب، حسن عسکری کاظمی، طارق بٹ، محمد حسین عارف القادری	20 تا 24
4	مضامین	محمد ارشاد، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، جمیل احمد عدیل، ہارون الرشید، طلعت شبیر، علی رضا، رانا خالد محمود قیصر، سید تحسین گیلانی، شری مرلی چندرا گوپی چند گھوگلیہ، آفتاب احمد ملک، صدام ساگر، سیدہ آمنہ ریاض، نادیہ عنبر لودھی، اعجاز رضوی	25 تا 76
5	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	77 تا 85
6	طنز و مزاح / خاکے	محمد کلیم، نور کمال شاہ، رانا محمد شاہد	86 تا 96
7	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، انور شعور، جلیل عالی، محسن اسرار، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، حسن عسکری کاظمی، ناصر علی سید، یعقوب پرواز، گلزار بخاری، خاور اعجاز، اختر شمار، رشید آفرین	97 تا 172

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
7	غزلیں	منظور ثاقب، آغا نثار، احمد جلیل، راحت سرحدی، واجد امیر رحمٰن حفیظ، اقبال سروبہ، اسلام عظمی، محمد انیس انصاری، اکرم ناصر ممتاز راشد لاہوری، جمشید چشتی، شکیل جاذب، حسنین سحر خورشید ربانی، محمد نوید مرزا، محمد سلیم ساگر، ریاض رومانی طالب انصاری، سجاد بلوچ، شوکت محمود شوکت، عقیل رحمانی ریاض ندیم نیازی، صغیر احمد صغیر، سعید راجہ، رخشندہ نوید شاہد ماکلی، شبہ طراز، ظہور چوہان، اشرف کمال، بشیر احمد حبیب ارشد محمود ارشد، آسناتھ کنول، علی حسین عابدی، انصر حسن افتخار شاہد، مرزا سکندر بیگ، راجہ عبدالقیوم، زبیر فاروق فیصل زمان چشتی، اکرم جاذب، تصور اقبال، نعیم رضا بھٹی زعیم رشید، سید ضیا حسین، عاصم اعجاز، عنبرین خان ازور شیرازی، اعجاز دانش، نادیہ عنبر لودھی، علی رضا بلوچ شہاب اللہ شہاب، امتیاز انجم، محمد علی ایاز، عالمگیر ہراج شفقت حیات شفق، نازیہ شکور ناز، کوکی گل، نائلہ راٹھور رخسانہ سمن، نادیہ سحر، نوید صادق، کنور امتیاز احمد، اعجاز رضوی	97 تا 172
8	افسانے	حامد یزدانی ، شاہین عباس ، احمد سجاد بابر صبا ممتاز بانو ، آصف عمران	173 تا 219
9	شاعرِ امروز	ممتاز گورمانی، وریدالله وریدؔ [شاہد ماکلی]	220 تا 222
10	نظمیں	امجد اسلام امجد، نسیم سحر، حمیرا راحت، گل بخشالوی عنبرین صلاح الدین، صغیر احمد صغیر، امجد بابر، نائلہ راٹھور زعیم رشید، شکور احسن، زین علی رضوی، اعجاز رضوی	223 تا 235
11	خطوط	آصف ثاقب، ممتاز راشد لاہوری، آفتاب احمد ملک ناصر نقوی، طالب انصاری ، رانا محمد شاہد	236 تا 241

حمد

اتری مرے خیال پہ مشک ختن تمام
سوچا خدا کا نام تو مہکا بدن تمام

طائر نسیمِ صبح کے ہمراہ صبح دم
ذکرِ خدائے پاک میں دیکھے مگن تمام

لکھا مرے قلم نے جب "ایاک نستعین"
خوشبو مثال ہو گئے حرف و سخن تمام

نبضِ حیات اس کے ہی دم سے رواں دواں
ٹھہرا ہے جس کے اِذن سے چرخ کہن تمام

طاقت تمام دین کے رستے میں صرف ہو
کام آئے اس کی راہ میں ضعف بدن تمام

سانسوں میں اس کے ذکر کی نوبت کی گونج ہے
تسبیح جس کی کرتے ہیں کوہ و دمن تمام

پلکوں پہ اک نمی سی ہے سرور بوقتِ حمد
گویا قبول ہو گئی مشقِ سخن تمام

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

مثالی ہے نمونہ خیر و برکت کی نہایت کا
بنایا ہے خُدا نے آپ کو منبع ہدایت کا

حضورؐ آئے، ہوا سکہ رواں توحید کا ہر سُو
ہوا پھر خاتمہ غیرِ خُدا کی ہر حکایت کا

رضائے ربِّ اعلیٰ کی ہوئی تعمیل ہر صورت
نہیں آیا زباں پر حرف شکوے اور شکایت کا

مٹایا ایک اک کر کے نشانِ بے اماں یکسر
بداندیشی، غلط کاری کی ہر بے جا روایت کا

صحابہ سیر چشم و بے نیازِ حُبِّ دُنیا ہیں
اُنھیں کافی اشارہ ہے فقط چشمِ عنایت کا

شریعت اور طریقت کے ہوئے روشن سبھی رستے
منوّر آپؐ کے دم سے ہوا جادہ ولایت کا

غلامی آپؐ ہی کی باعثِ توقیر ہے ہم کو
مُکلّف ہی نہیں یہ ضابطہ حدِّ ارادت کا

انھی کے فیض سے ہم پر کشادہ تر ہوا رستہ
شرافت کا، محبت کا، مروّت کا، مودّت کا

مُسلّم ہے یہ ہر پہلو سے یکتا ہے یگانہ ہے
بھرم اُونچا ہے سیرت کی روایت کا و رایت کا

ریاض خوش ہنر پر نعت کے انوار اُترے ہیں
مزہ اِن میں بہت ہے معنویت کا، عنایت کا

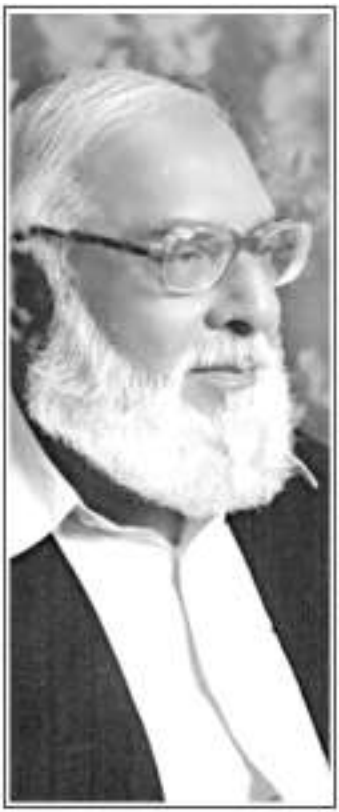

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

مِدحت میں ہوئی شامل تاثیر مدینے کی
ہر نعت ہوئی میری تفسیر مدینے کی

دراصل ہوئی اُس دِن تعمیر مدینے کی
ہجرت نے سنواری جب تقدیر مدینے کی

سب کون و مکاں روشن انوارِ مدینہ سے
ہر سمت میں پھیلی ہے تنویر مدینے کی

پہچان مدینے کی سرکارِ دو عالم سے
سرکارِ دو عالم سے توقیر مدینے کی

بھر لایا ہوں دامن یوں اُس شہرِ عقیدت سے
لے آیا ہوں آنکھوں میں تصویر مدینے کی

کرتا ہوں دُعا ہر دَم، آزاد نہ ہو جاؤں!
ایسی ہے محبت کی زنجیر مدینے کی

اے کاش، ہو آنکھوں میں ہر خواب مدینے کا
ہر خواب سے ظاہر ہو تعبیر مدینے کی!

کچھ اَور نسیمؔ اب کیا اِس لوح پہ مَیں لکھوں!
جب نقش ہوئی دل پر تحریر مدینے کی

نسیمِ سحر

نعتؐ

خوب ہے کھلی قسمت بے ثبات لفظوں کی
ڈھل گئی درودوں میں صوتیات لفظوں کی

اُنؐ کے علم و حکمت کی اک گرہ نہ کھل پائے
ہو اگرچہ دامن میں کائنات لفظوں کی

ذکر جب بھی ہوتا ہے حسنِ ماہِ طیبہ کا
نور بیز ہوتی ہیں شش جہات لفظوں کی

معجزہ نظر آئے لفظ لفظ آقاؐ کا
چھیڑتے ہیں اہلِ فن جب بھی بات لفظوں کی

بارگاہِ مدحت ہے اور میں فرومایہ
کاش! کچھ سمجھ پاؤں رمزیات لفظوں کی

یہ تو سوز ہے دل کا، جاں بھی ہے گداز اس میں
کب ثنائے خواجہؐ ہے واردات لفظوں کی

گردِ راہ ہوتی ہے جادۂ عقیدت میں
کہکشاں جو بنتی ہے ساری رات لفظوں کی

وقفِ فکر و فن کردو مدحِ سرورِ دیں میں
اے قمر اگر چاہو تم حیات لفظوں کی

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

آنکھ سے مَیں نے لگایا جب کبھی موئے رسولؐ
میرے اطراف و جوانب پھیلی خوشبوئے رسولؐ

جو کہا اور جو کیا مرضیِ رب کے ساتھ تھا
خوئے حق ہر دَم رہی ہے شاملِ خوئے رسولؐ

حشر میں ہم سے گنہ گاروں کی بخشش ہو گئی
ایک لحظہ کو ہُوا جب اِس طرف روئے رسولؐ

کاخِ دُنیا کیا ہماری حیثیت پہچانتا
ہم نبیؐ کی خاکِ پا، ہم ذرّۂ کوئے رسولؐ

کچھ زمینِ شوق ہی احسان مند اُنؐ کی نہیں
شانۂ افلاک تک پھیلے ہیں گیسوئے رسولؐ

خاور اعجاز

میرے بچوں، میرے شہروں، میرے قصبوں کا
حافظ آپؐ کے صدقے ٹھہرے ستار و غفار

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

نعتؐ

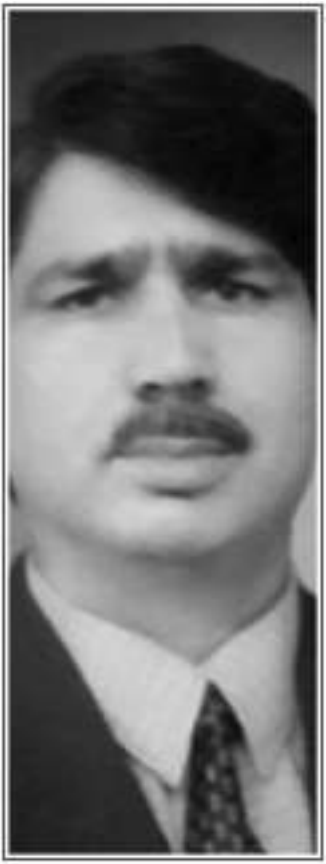

آنکھیں سجود میں ہیں تو دل کا قیام ہے
حیران ہیں کہاں پہ یہ اپنا قیام ہے

اشکوں کے ساتھ ساتھ ہے تاروں کا قافلہ
اور نعت کے سفر میں مدینہ قیام ہے

دل سے نکال جتنے بھی وہم و گمان ہیں
اس راہ میں یقین ہی پہلا قیام ہے

اب اپنی زندگی ہے مسلسل سفر کا نام
منزل قیام ہے نہ یہ رستہ قیام ہے

میں سوچتا ہوں غار حرا میں گزار لوں
دل کے سفر میں ایک مہینا قیام ہے

سجدہ ضرور آئے گا اگلے پڑاؤ میں
فی الوقت تو یہ سارا زمانہ قیام ہے

اختر شمار

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک خوشبو سے مہک رہے ہیں آئینہ خانے
زینہ زینہ، نس نس اُتری، چاہت کی مہکار

نعتؐ

ذکرِ محبوب سے دل کتنا سکوں پاتا ہے
جتنا دہراتا ہوں میں ، اتنا مزہ آتا ہے

میں مدینہ میں جو پہنچا تو یہ دل چیخ اٹھا
سر نہیں ہے، تو جو قدموں پہ چلا جاتا ہے

چھیڑ کر ذکر مدینہ کے گلی کوچوں کا
دل کو بہلاتا ہوں میں، دل مجھے بہلاتا ہے

خواہشِ وصل جو آنکھوں سے رواں ہوتی ہے
گنبدِ پاک مرے خواب میں آ جاتا ہے

روز منصوبے مدینے کے بناتا ہوں، مگر
روز پاؤں مری چادر سے الجھ جاتا ہے

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

قصد مدح کیے بیٹھا ہے پھر خالد احمد
شان خدا، خوشبو کے کنگن، ڈھالے گا لوہار

نعتؐ

کُھل جائے گی ہر اک پہ حقیقت حضورؐ کی
محشر میں دیکھیے گا حکومت حضورؐ کی

زندہ ہے ، اور زندہ رہے گا اَبد تلک
جس دل میں بَس گئی ہے محبت حضورؐ کی

ایماں اُسی کا اکمل و کامل ہے صاحبو!
جس دل میں جاگزین ہے اُلفت حضورؐ کی

ہم جی رہے ہیں رحمتِ عالم کی چھاؤں میں
صَد مرحبا! سَروں پہ ہے رحمت حضورؐ کی

ربِّ غفور ! میری تہی دامنی نہ دیکھ
فردِ عمل میں لایا ہوں نسبت حضورؐ کی

جانِ انیس! حضرتِ حسانؓ ہوں جہاں
کیسے بیاں ہو آپ سے مدحت حضورؐ کی

محمد انیس انصاری

نعتؐ

دِلوں تک اسمِ احمدؐ کی رسائی ہو رہی تھی
فضا ساری کی ساری مصطفائی ہو رہی تھی

جہالت کے اندھیروں کو مٹایا جا رہا تھا
جہاں میں علم کی فرمانروائی ہو رہی تھی

صدائے حق سے گونج اُٹھا تھا اِس کا کونہ کونہ
وہی خطہ جہاں ہر اِک برائی ہو رہی تھی

لکھے جانے تھے اِس پر آپؐ کے اوصافِ اعلیٰ
گناہوں سے بھرے دل کی صفائی ہو رہی تھی

فرشتوں نے کبھی دیکھے نہ تھے ایسے مناظر
فلک پر آپؐ کی یوں پیشوائی ہو رہی تھی

درودِ پاک ہم بھی پڑھ رہے تھے اور وہ بھی
ریاضؔ اپنی خدا سے ہمنوائی ہو رہی تھی

ریاض رومانی

ناموروں کو کب بھائے گی، میری رسوائی
مجھ کو حضورؐ کی اوٹ رکھنا، اے ربِ ستار!

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نعتؐ

زباں کو وصفِ درود و سلام چاہیے ہے
نظر کو روضۂ خیر الانام چاہیے ہے

اسی میں راز ہے پنہاں مری فضیلت کا
مجھے غلاموں میں ادنیٰ مقام چاہیے ہے

کچھ اس لئے بھی مدینے کی رہگزر میں ہوں
کہ مجھ کو لذتِ کیفِ دوام چاہیے ہے

نہ چاہیے مجھے دنیا میں مرتبہ کچھ بھی
جو چاہیے تو گداؤں میں نام چاہیے ہے

وہ جس دیار میں مسکن ہے میرے آقا کا
تمام عمر وہیں تو قیام چاہیے ہے

انھی کے کوچے میں کٹ جائے زندگی کہ مجھے
فضائے شہرِ مدینہ مدام چاہیے ہے

جہاں میں بھی مری نسبت رہی ہے ان سے رضا
اسی حوالے سے محشر میں نام چاہیے ہے

علی رضا

نعتؐ

نور ہی نور دل و جاں میں سمایا ہوا ہے
سبز گنبد جو مرے دھیان میں آیا ہوا ہے

رات لگتی ہے کسی اجلے ہوئے دن کی طرح
نکہت و نور میں یہ شہر نہایا ہوا ہے

آپ کا نام زباں پر جونہی آیا تو لگا
جیسے خوشبو میں کوئی شہد ملایا ہوا ہے

صاحبِ نعت نے خود نعت سنی ہے ایسے
ایک منبر پہ حسان بچھایا ہوا ہے

دستِ قدرت نے ابد تک کے لئے دنیا میں
ایک ہی نقش محبت کا بنایا ہوا ہے

آلِ اطہار کے صدقے سے دعا کیا مانگی
ہاتھ قسمت نے مری سمت بڑھایا ہوا ہے

ان کے بارے میں یہ کیا کہتے ہو کچھ ہوش کرو
جن کو سرکار نے پہلو میں سلایا ہوا ہے

اس کی تعبیر مجھے نعت کی برکت سے ملے
مجھ کو بیداری نے جو خواب دکھایا ہوا ہے

دست بستہ سبھی اصناف سخن سے رخصت
نعت کا مصرعہ مرے ذہن میں آیا ہوا ہے

کیسے دنیا میں ہو توقیر ہماری سرور
ہم نے سرکار کی سیرت کو بھلایا ہوا ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

ان کے قدموں کی دھول ہو جاتا
میں بھی جنت کا پھول ہو جاتا

کاش اصغرؔ مرا عمل کوئی
ان کے حسبِ اصول ہو جاتا

میری مٹی بھی آسماں ہوتی
خاکِ پائے رسول ہو جاتا

کاش ہوتا زمین کا ٹکڑا
غار کا عرض و طول ہو جاتا

جرعۂ آب ہی اگر ہوتا
نذرِ پسرِ بتول ہو جاتا

حرف ہوتا لبِ محمدؐ کا
دو جہاں میں قبول ہو جاتا

لفظ ہوتا کوئی محبت کا
جزوِ حلف الفضول ہو جاتا

مجھ پہ قلبِ بلال کی صورت
روشنی کا نزول ہو جاتا

اصغر علی بلوچ

نعتؐ

سرکار کا کرم ہے جو بارانِ نعت ہے
مولا تری عطا سے ہی فیضانِ نعت ہے

یادِ رسولِ پاک سے دل میں گداز ہے
آنکھوں سے اشک برسے ہیں، امکانِ نعت ہے

ہر سمت تیرے نور کے جلوے نگاہ میں
"ہر شعبۂ حیات میں امکانِ نعت ہے"

سرکار کے گھرانے سے ملتی ہے روشنی
روشن جہان سارا بہ فیضانِ نعت ہے

تیرا وجود مرکز و محور ہے خیر کا
تیرا کلامِ نور ہی سامانِ نعت ہے

رب کی عطائے خاص ہے انعام فاطمہ
مالک کی یہ عطا بھی تو احسانِ نعت ہے

ذکرِ حبیب کرتے ہیں عشاق ہر گھڑی
ان کی زباں پہ ذکر بھی شایانِ نعت ہے

پتھر بدست لوگوں کے حق میں تری دعا
طائف کا سارا واقعہ خاصانِ نعت ہے

سجدہ طویل کرکے نواسے کے واسطے
سب کو دکھا دیا کہ یہ ریحانِ نعت ہے

سرکار کے کرم کی بدولت ہوں نیک نام
جتنا ہے میرا نام یہ احسانِ نعت ہے

سید فرخ رضا ترمذی

نزولِ قرآن.....

چار سو جلوۂ لولاک لما رقص میں ہے
والقلم! سلسلۂ ارض و سما رقص میں ہے

ذات سے اٹھ گئے جب سارے حجاباتِ صفات
دیکھا "اِلا" کو کہ در پردۂ لا رقص میں ہے

لیلۃ القدر میں خورشید بکف ہے جبریلؑ
جبلِ النور پہ خود نورِ ہدیٰ رقص میں ہے

جس کو ہونا ہے شرف یاب ردائے تطہیر
خرقۂ فقر پہ راضی بہ رضا رقص میں ہے

صبحِ تہذیبِ طریقت کی اذاں سے پہلے
ہمہ تن کارگہِ قدر و قضا رقص میں ہے

کافۃ الناس ہے سرچشمۂ عرفانِ وجود
دوشِ رحمت پہ رسالت کی ردا رقص میں ہے

عرشِ اعیان کی لے فرشِ زمیں تک پہنچی
سازِ اقرا پہ شبستانِ حرا رقص میں ہے

جھوم اٹھا تھا جسے دیکھ کے خود نورِ ازل
آج وہ حسنِ ازل صلِ علیٰ رقص میں ہے

وجد میں عالمِ امکاں ہی نہیں ہے، والعصر
اپنے نغمات پہ خود نغمہ سرا رقص میں ہے

عالمِ وجد میں ہے ارضِ فلسطین و حجاز
آج پھر وادیٔ مروا و صفا رقص میں ہے

قلبِ امی پہ اتر آئی کتاب محفوظ
للہ الحمد براہیمی دعا رقص میں ہے

سید فخر الدین بلّے

عقیدت

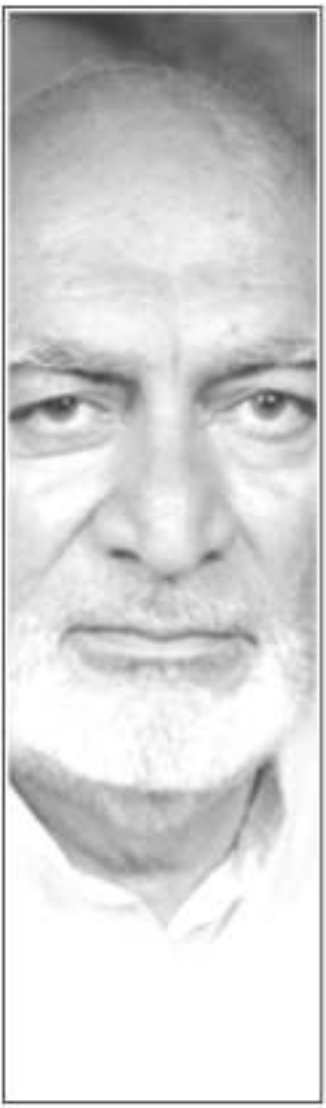

قلم کی نسبتیں کتنی بڑی ہیں
بہت ہی پیار سے نعتیں لکھی ہیں

بڑے چھوٹے یہ پاکستان والے
محمدؐ نام کے عاشق سبھی ہیں

مدینے کے ہیں نغمے سوز والے
غزل کی بھی غنائیں مدھ بھری ہیں

مدینے سے سبق ہم کو ملا ہے
روانِ رہگزارِ زندگی ہیں

محمدؐ نے یہ بخشے ہیں اجالے
جو ہم دامن کشائے آگہی ہیں

عقیدت کے مناظر ہیں سنہرے
ہمارے سامنے صدیاں کھڑی ہیں

محبت یہ مدینے سے ملی ہے
جو اپنے غم رہینِ شاعری ہیں

دعا، آداب، آنسو، شوق ثاقب
نبیؐ کے شہر کے رستے کئی ہیں

آصف ثاقب

عقیدت

آنکھ پرنم اور میں ہوں باوضو
روضۂ اطہر ہے میرے روبرو

نور میں ڈوبی مدینے کی فضا
قمقمے روشن ہیں میرے چارسُو

زائروں کا اس قدر دیکھا ہجوم
اشکِ پیہم سے ہوا سب کا وضو

لب پہ ہے یا رحمتؐ اللعالمیں
آپؐ کے دم سے ہماری آبرو

نام لیوا آپؐ کے جائیں کہاں
ہر طرف برپا ہوئی ہے ہاؤ ہو

کیجیے چارہ یہی فریاد ہے
ہو چکا ارزاں مسلماں کا لہو

حسن عسکری کاظمی

عقیدت

آپ سے ہے دینِ قیم، آپ کی نسبت سے ہم
یہ نشاں قائم تو کس کو عُقبیٰ و دنیا کا غم

یا رسول اللہ محبت آپ کی دل پر رقم
یا رسول اللہ محبت آپ کی ہم کو انم

یا رسول اللہ ہے اُسوہ آپ کا دوزخ نجات
یا رسول اللہ ہے اُسوہ آپ کا جنت قدم

یا نبی یا احمدِ مختار یا خیر البشر
آپ کی نسبت سے امت کا لقب خیر الامم

دل کی ہر اک ضرب ہے صلِ علیٰ صلِ علیٰ
اور لب پر یا محمد یا محمد دم بدم

طارق بٹ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون دلوں میں الاؤ لگا دے چاہ کی چاہت کے
کس کے در کا پہرہ دینے، جاگیں چوکی دار

دعا

اے دعا آج کچھ اثر کر دے
کملی والے کو اب خبر کر دے

لطف و رحمت کی خاص بارش سے
دل کے صحرا کو تر بہ تر کر دے

میری قسمت میں شہرِ طیبہ کی
نوری نوری سی رہگزر کر دے

آنکھ دیکھے نبی کے روضے کو
آج روشن مری نظر کر دے

میرے مالک مرے نصیبوں میں
ان کی نگری کی اک سحر کر دے

میری نعتوں میں روشنائی ہو
میری سوچوں کو دیدہ ور کر دے

تیری دنیا میں مثلِ کنکر ہے
اپنے عارف کو تو گہر کر دے

محمد حسین عارف القادری

چلتے چلتے

قارئین بیاض کے خطوط میں کسی نہ کسی خط میں کوئی نہ کوئی بات ایسی بھی ہوتی ہے جو بات بڑھانے کا سبب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایک خط میں قومی لباس کا ذکر بھی آیا ہے۔ آیا اس میں پگڑی شامل ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو کیوں نہیں جبکہ پگڑی پاکستان کے ہر خطے کا صدیوں سے پہناوا چلا آ رہا ہے۔ ہمارا قومی لباس کیا ہے؟ شلوار / پاجامہ، شیروانی اور جناح کیپ۔ بھارتیوں کا قومی لباس پاجامہ شیروانی اور نہرو کیپ۔ پیزار؟ وہی جو انگریزوں سے متعارف ہوا۔ قمیض؟ غیر متعین۔ قومی لباس قومی تقریبات کے لیے ہی مخصوص۔ شیروانی اور قراقلی ٹوپی اور پاجامہ گزشتہ صدی یعنی انیسویں صدی کے قاچاری بادشاہوں اور شہزادوں کا پہناوا تھا۔ پاجامہ ہند میں پہلے سے موجود تھا جو تیموری دور میں رواج پا گیا۔ قراقلی ٹوپی (جناح کیپ) ازبک لوگوں کا پہناوا تھا جو افغانستان و ایران میں مقبول ہوا اور افغانستان سے خیبر پختونخوا اور بلوچستان کی پشتون پٹی میں قراقُل ازبکی، ترکی اور منگولی (منغولی، مغولی، مغلی) زبان کا لفظ ہے۔ قائداعظم نے یہ ٹوپی کوئٹہ سے خرید کر سر پر رکھی۔ نہرو کیپ پنڈت جواہر لال نہرو نے حکیم اجمل خان کے سر سے اُتار کر اپنے سر پر سجالی۔ پاجامہ، شیروانی اور پیزار پاکستانی اور بھارتی قوموں میں مشترک۔ بھارتیوں کو چاہیے تھا کہ نہرو کے لباس کو قومیانے کے بجائے گاندھی جی کا لباس قومی لباس ٹھہراتے جو صرف دھوتی تھا اور بھارت کی آب و ہوا اور موسمی حالات کے مطابق۔ ہر خطے ہر علاقے کے لباس کا اس خطے کے موسمی حالات و آب و ہوا سے گہرا تعلق رہا ہے۔ شلوار برفانی اور سخت سرد یا کم سرد علاقوں کا پہناوا ہے اور اسی نسبت سے پائنچوں کی تنگی اور چوڑائی بھی کم اور زیادہ ہوتی رہی ہے۔ لنگ، یا تہمد گرم، خطوں کے لوگوں کا لباس ہے تاکہ جسم کے نچلے حصے کو ہوا لگتی رہے اور اسی غرض سے قمیض بھی کھلی، آستینیں فراخ ہوتی ہیں۔ پگڑی کا سائز بھی گھٹتا بڑھتا رہا ہے۔ جس کا کچھ حصہ گردن کے گرد لپیٹ دیا جاتا ہے۔ مفلر کی غایت بھی یہی ہے اور

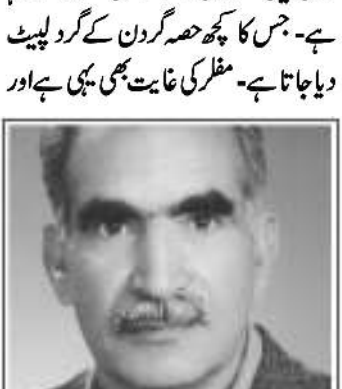

محمد ارشاد

بعض علاقوں میں کچھ حصہ حرام مغز (madulla oblongata) اور ریڑھ کے گودھے کو دھوپ کے مضر اثرات سے بچانے کے لیے پیچھے لٹکا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کا تنوع پاؤں کے پہناووں میں بھی موجود رہا ہے۔ ہمارا قومی لباس جو معلوم نہیں کس نے مقرر کیا، ہمارے کسی بھی خطے کے موسمی حالات اور آب ہوا سے مطابقت نہیں رکھتا، بندہ بند بوتل لگتا ہے۔ قومی لباس، قومی ترانہ، قومی جانور، قومی پھول، قومی زبان، قومی جھنڈا، قومی پھول، جن کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا قومی کھانا، قومی مشروب، قومی پرندہ، قومی نگینہ (قیمتی پتھر) قومی ہتھیار، قومی موسم:

خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

.....

لنگ، تہمد، گرمی اور humidity اور جس کی بنا پر گھٹنے گھٹنے دھوتی بن گئی اور پگڑی گھٹنے گھٹنے پٹھ بن گئی:

پٹھ و ریش میرزا بیدل
بچۂ ریش و بچۂ دستار

یہی پٹھ مولانا فضل الرحمٰن کے سر پر بھی نظر آتی ہے۔ البتہ لنگ کے بجائے شلوار پہنتے ہیں۔ جبکہ ان کا تعلق ڈیرہ اسماعیل خان سے ہے۔ ڈیرہ اور بنوں، پختونخوا کے وہ علاقے ہیں جہاں سخت گرمی پڑتی ہے اور لوگ شلوار پر لنگ کو ترجیح دیتے ہیں۔ مرزا بیدل کی پٹھ اور ریش کا تعلق بھی موسم اور آب و ہوا سے تھا نہ کہ تنکا چھپانے کے لیے، جو تھا ہی نہیں کہ داڑھی بڑھاتے۔

گر یک سرِ موست آدمیت کافی ست
چوں خرس ز سر تا بہ قدم ریش مباش

.....

یک جہتی اپنی جگہ مستحسن سہی تنوع میں اپنا حسن ہے۔ سوائے قومی ترانے اور قومی پرچم کے کوئی شے پوری قوم میں مشترک نہیں۔ اصل یک جہتی مقاصد کی یک جہتی ہے جو کسی بھی انبوہ کو قوم بناتی ہے۔ قومی یک جہتی 1965 کی پاک بھارت جنگ میں نظر آئی، بعد میں نہیں، سن 1971 میں ملک دو ٹکڑے ہو گیا جو تقسیم مقاصد کا نتیجہ تھا۔ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد بنا اور دو قومی نظریے کی بنیاد پر ٹوٹا بھی، ہم ایک قوم بنگلہ دیش دوسری قوم۔ معلوم نہیں پاکستان سے غداری اِدھر کے پاکستانیوں نے کی یا اُدھر کے پاکستانیوں نے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پوری قوم کسی غلط مقصد پر یک دل و یک زباں ہو جائے اور کوئی بندہ اُٹھ نتائج و عواقب سے آگاہ کرنے پر پوری قوم کے تمسخر اور لعن و دشنام کا ہدف بن جائے۔ برٹرینڈ رسل بھی ایسا ہی جرأت مند اور جرأت آزما تھا جو پہلی جنگ عظیم میں اپنی قوم کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا۔ جب جنگ کے بادل پورے دنیا پر منڈلا رہے تھے اور تباہی، ہلاکت اور خونریزی یقینی تھی تو اس نے سوچا انگریز مہذب قوم ہیں جنگ چھڑی تو اس میں شریک نہیں ہوں گے۔ کئے آپس میں کسی اعلیٰ آدرش کی خاطر نہیں لڑتے اس

لیے لڑتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے کی بو اچھی نہیں لگتی۔ برطانیہ نے جنگ میں شریک ہونے کا فیصلہ کرلیا اور برٹرینڈ رسل نے مخالفت کا۔ ایک طرف تخت سلیماں اور اس کے پایہ بردار اور دوسری طرف مورنا تواں اور اس کے رفقائے کار۔ مانچسٹر گارڈین میں برطانیہ کے غیر جانبدار رہنے کے حق میں اور جنگ کی مخالفت میں بیان شائع کروایا لیکن کیمبرج یونیورسٹی کے جن اساتذہ نے اس بیان کی تائید میں دستخط کیے جنگ کے پہلے دن ہی حوصلے ہار گئے وائٹ ہیڈ (جس کے ساتھ مل کر Principia mathematice لکھی اور اپنے گھر میں ٹھہرایا) گلبرٹ مرے (رشتے میں ماموں) اور میکٹیگرٹ (علامہ اقبال کے استاد گرامی) بہت پرانے دوست بھی جنگ پرست نکلے۔ میکٹیگرٹ نے نہ صرف اسے جرمنوں کا پٹھو کہا بلکہ کیمرج یونیورسٹی میں اس کے اخراج کی خاطر کامیاب جلوس بھی نکالا، چہ خوش گفت قرۃ العین طاہرہ

نہ بازی ست رفتن بمیدان عشق
کہ از صد ہزاراں یکے پا فشرد

.....

برٹرینڈ رسل اکیلا رہ گیا۔ بزبان سیف الدین سیف:

میں اکیلا نخل صحرا کی طرح سب سے الگ
یار تیرے شہر میں اغیار تیرے شہر میں

.....

اپنے چہیتے شاگرد ٹی ایس ایلیٹ کو ہموا بنانا چاہا تو اس نے کہا میں کچھ نہیں جانتا بس یہ جانتا ہوں کہ میں امن پرست نہیں ہوں:

اسی کی سی کہنے لگے اہل شہر
کہیں پرسش داد خواہاں نہیں

.....

طویل جنگ میں ہر طرف تباہی و بربادی، ملبے کے ڈھیر بیوہ عورتیں، یتیم بچے ان خدشات کا ثبوت تھے، جن سے وہ اپنی قوم کو آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو پوری قوم خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ راہ چلتے مرد اور عورتیں ایک دوسرے اجنبی جب ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے تو گلے ملتے ایک دوسرے کے گالوں پر بوسے دیتے اور جدھر جانا ہوتا چلے جاتے۔ برٹرینڈ رسل اس حال میں ہلاکت، تباہی پر مغموم اور اکیلا تھا۔ پہلے بھی اکیلا تھا اب بھی اکیلا پہلے یہ حال:

بیا اے عشق و رسوائے جہانم کن کہ یکچند ے
نصیحت ہائے بیدرداں شنیدن آرزو دارم

اور اب یہ:

معشوق در آغوش و منم آئینہ برکف
از بسکہ دلم شیفتۂ زشتیِ خویش است

.....

قوم خویش کے بھیانک چہرے کا نظارہ آئینے میں کر رہا تھا۔ لاکھوں انسانوں کی ہلاکت اور عمارتوں کی تباہی کے بعد امن کی خوشی؟

عید ہوئی ذوق ولے شام کو

.....

اس عید کی خوشی بھی کیا خوشی۔

ہادی اعظم صلی اللہ علی وسلم کا فرمان پاک

ہے کہ جب برائی کو دیکھو تو ہاتھ سے روکو، نہ روک سکو تو زبان سے روکو یہ بھی نہ کر سکو تو دل میں اسے بُرا جانو۔ وہ مسلمان نہیں تھا، کسی اور دین کا پیرو بھی نہیں تھا، یکہ و تنہا اپنے دور کی تین سپر پاورز سے نہتا ٹکرا گیا جنگ کی مخالفت بقول اس کے "اس کے اندر خدا کی آواز تھی" جسے سن کر اس نے لبیک کہا۔ "احتجاج کتنا ہی غیر مؤثر کیوں نہ ہو فرض تھا" جسے ادا کرتا رہا۔ بار بار جیل جانا پڑا، جرمانے ہوئے لعن طعن ہوا، ڈٹا رہا۔ دوسری عالمی جنگ میں وہ جرمنی کے خلاف تھا لیکن یہ بھی کہتا تھا کہ اگر پہلی جنگ میں جرمنی کو ذلت آمیز معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور نہ کیا جاتا تو نہ ہٹلر کو آنے کو موقع ملتا نہ فاشزم کی راہ ہموار ہوتی۔ فاشزم کیا ہے مقتدرہ کے اختیار اور آزادی میں رکاوٹ اور اس پر قدغن۔ دوسری عالمی جنگ کے ابتدائی سالوں میں اسے شکاگو یونیورسٹی نے مہمان پروفیسر کے طور پر بلا لیا، پھر کیلیفورنیا یونیورسٹی نے۔ اسی دوران میں جنگ ختم ہو گئی۔ نیو یارک کے اعلیٰ تعلیمی بورڈ نے پروفیسر شپ پیش کی، وہاں چلا گیا، وہاں پہنچا تو اس کے خلاف ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ایک کیتھولک پادری نے الحاد کا الزام لگاتے ہوئے امریکا سے اس کے اخراج کا مطالبہ کر دیا۔ ایک خاتون مسز کے آف بروکلن نے اس کے خلاف اس بنا پر مقدمہ کر دیا کہ اس کی تعلیمات سے مدعیہ کی بیٹی کے اخلاق باختہ ہونے کا خطرہ ہے۔ مقدمے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ لبرل آرٹس کالج میں ریاضیاتی منطق کی تعلیم پر مامور تھا اور ریاضیاتی منطق کا اخلاقیات سے دور کا بھی تعلق نہیں اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ کہ لبرل آرٹس کالج صرف لڑکوں کا کالج تھا، لڑکیاں داخل ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ فاضل جج نے اسے اپنے دفاع میں بولنے کی اجازت نہیں دی کہ وہ فریق مقدمہ نہ تھا۔ مدعیہ کے وکیل نے عدالت نے کو بتایا کہ وہ شہوت پرست، اخلاق باختہ، کمینہ، تنگ نظر، مکار، جھوٹا آدمی ہے اور یہ کہ وہ کسی بھی لحاظ سے فلسفی نہیں۔ نہ تو محب دانائی ہے نہ جویندۂ دانائی وہ جن نظریات کو فلسفہ کہتا ہے لچر ڈھکوسلے اور بے بنیاد قضیات ہیں۔ انسانی حقوق کے سب سے بڑے علمبردار ملک میں اسے اپنے دفاع میں بولنے کی اجازت نہیں تھی صرف سننے کی اجازت تھی کہ وہ فریق مقدمہ نہ تھا جب کہ مقدمہ اسی کے خلاف تھا۔ پادریوں نے (جو اپنے آپ کو خدا کا نمائندہ اور نائب سمجھتے ہیں) اسے شیطان کا نائب ٹھہرایا، جگہ جگہ اس کے خلاف پوسٹر لگائے گئے، نیو یارک میں ہونے والی تمام مجرمانہ وارداتوں کا محرک اسے ٹھہرایا گیا۔ نیو یارک کے رجسٹرار نے برسر عام یہ بیان دیا کہ اسے دھکے دے دے کر امریکہ سے کھدیڑا جائے۔ وہ امریکا میں نہیں رہنا چاہتا تھا لیکن اپنے ملک کا سفارت خانہ بھی اسے واپسی کا ویزا دینے کو تیار نہیں تھا مبادا واپس جا کر پھر کوئی گڑبڑ نہ

کرے - برطانوی سفارت خانے کے ارباب بست وکشاد اس کی ہر حجت کا جواب کٹ حجتی سے دینے لگے- آخر کار اسے ایک ایسی دلیل مل گئی جسے وہ کسی صورت رد نہیں کر سکتے تھے- ان سے کہا کہ کیا تم یہ مانتے ہو کہ موجود جنگ فاشزم کے خلاف ہے سب نے اثبات میں جواب دیا کہا کہ کیا تم تسلیم کرتے ہوئے کہ مقننہ پر انتظامیہ کی بالادستی فاشزم کی روح ہے یہ اقرار کروا لینے کے بعد کہا کہ میں ہاؤس آف لارڈ کا رکن ہوں، ایسا ہے کہ نہیں جواب ملا ایسا ہی ہے - کہا کہ اب تم انتظامیہ ہوں اور میں مقننہ کا رکن اگر تم ضرورت سے زیادہ ایک دن بھی مقننہ سے متعلق مجھے میرے فرائض سے محروم رکھتے ہو تو تم فاشسٹ ہو- متفقہ قہقہے کی فضا میں اسے وطن واپس جانے کا اجازت نامہ مل گیا- اور وہ مئی 1944 میں انگلستان واپس آ گیا-

دوسری سپر پاور امریکا کی تیسری دنیا کے ممالک میں دخل اندازیوں کے نتیجے میں بدامنی، حکومتوں کی اکھاڑ پچھاڑ اور افراتفری کے خلاف بھی وہی سینہ سپر ہوا- ویت نام میں امریکہ کے لرزہ خیز مظالم کے خلاف شہادتوں پر بحث کرتا رہا- جرائم پر سزا پر عمل درآمد تو ہو نہیں سکتا تھا لیکن امریکی عوام کی رائے حکومت کے خلاف ہو گئی اور بغیر فتح حاصل کیے جنگ ترک کرنا پڑی 1965 کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کے حق میں آواز اُٹھائی- اسرائیل کے فلسطین میں مظالم پر بھی ٹریبونل قائم کرنا چاہتا تھا کہ زندگی نے مہلت نہ دی- وہ دنیا میں ہونے والی افراتفری، اکھاڑ، پچھاڑ، زیادتیوں کا ذمہ دار امریکا کو سمجھتا تھا اور یہی کہتا تھا

As long as US is super power the world cannot reveive a sigh in peace.

انقلاب روس کے بعد 1920 میں روس کا دورہ کیا، لینن سے بھی ملاقات ہوئی- روس جانے سے بالشویکی انقلاب کے بارے میں جس خوش فہمی میں مبتلا تھا قائم نہ رہ سکی- قیام روس کے دوران میں دہشت ناک جاسوسی نظام اور آمرانہ بیوروکریسی سے وحشت محسوس ہونے لگی تھی- وہ جتنی مدت وہاں رہا بقول اس کے افلاس، شقاوت، شک وشبہ اور جور وستم کی فضا میں سانس لیتا رہا- اپنے قیام کی مدت کو بھیانک خواب قرار دیا- پنیر وگراڈ میں چار مشہور و معروف شعرا اس سے ملنے آئے چاروں خستہ حال تھے ان میں ایک کو حکومت نے عروض (Prosody) پڑھا کر روزی کمانے کی اجازت اس ہدایت کے ساتھ دے رکھی تھی کہ وہ یہ علم مارکسی نقطۂ نظر سے پڑھائے اور اس بیچارے کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ علم عروض کا مارکس سے کیا تعلق بنتا ہے- پھر وہ وقت بھی آیا جب سوویت یونین کی مزید زیاں کاریوں کے خلاف آواز اُٹھائی تو ماسکو ریڈیو نے اس کی پکار کو "بھیڑیے کا واویلا" قرار دیا- وہ بالشویکی انقلاب کو آزادی اور دکھوں کا مداوا

سمجھتا تھا، اسے کیا معلوم تھا کہ یہ کہنا پڑے گا

از در دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

.....

اس بطل عظیم کی ساری داستان حیات اس کے اپنے الفاظ میں صرف اتنی تھی،

"تین سادہ مگر انتہائی توانا داعیات کا میری زندگی پر تسلط رہا ہے۔ محبت کی تمنا، علم کی طلب اور دکھیارے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت سوز و گداز۔ یہ داعیات تلاطم خیز ہواؤں کی صورت کرب کے گہرے سمندر پر مجھے یہاں سے وہاں ادھر سے ادھر ہچکولے کھلاتے، مایوسی اور بیچارگی کے عین کنارے پر چھوڑ آتے رہے۔

میں محبت کا جویا تھا ایک تو اس لیے کہ یہ جذب و مستی سے ہمکنار کیے رہتی ہے جس کی چند مسرت آگیں گھڑیاں ایسی ہیں جن پر اپنی بقیہ پوری زندگی کو نثار کر دینے کو اکثر جی چاہا۔ دوسرے اس لیے کہ یہ تنہائی کا ازالہ ہے، اس وحشت ناک تنہائی کا جس میں ٹھٹھرتا ہوا شعور اتھاہ بے زیست کائنات کے حاشیے پر ہی نگاہ ڈال سکتا ہے۔ میں محبت کا جویا اس لیے بھی تھا کہ محبت میں کھو کر کم تر درجے کی صوفیانہ واردات قلبی کے طور پر میں نے اس جنت کا نقشہ ابھرتے دیکھا جو مہاتماؤں اور شاعروں کی چشم تخیل کے سامنے رہتا ہے۔

ایسی ہی لگن کے ساتھ میں نے علم کی جستجو بھی کی۔ میں نے لوگوں کے دلوں کو سمجھنا چاہا، یہ بھی جاننا چاہا کہ تارے روشن کیوں ہیں۔ میں نے اس فیاض غوری قوت کو پا لینے کی سعی کی جس کی بنا پر کائنات میں اعداد کو استقلال حاصل ہے۔ بہت تو نہیں پر کچھ نہ کچھ میں نے اسے پا لیا ہے۔

محبت اور علم سے جو کچھ مجھے مل پایا آسمانوں کی بلندیوں تک پہنچاتا رہا لیکن دکھیاروں کے دکھوں سے میری ہمدردی مجھے واپس زمین پر لے آتی رہی۔ دکھیا لوگوں کی گونجتی آہیں میرے دل کے پردوں سے ٹکرا کر دوبارہ گونج اٹھتیں، فاقہ کش معصوم بچے، ظالموں کے ظلم سے نڈھال لوگ، اپنی اولاد پر ناخواستہ بوجھ محتاج بوڑھے والدین، افلاس دکھ اور تنہائی سے بھری دنیا ان اعلیٰ آدرشوں کا منہ چڑا رہے ہیں جن کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔ میں ان مصائب کو کم کرنا چاہتا ہوں لیکن نہیں کر سکتا۔ میں خود بھی تو انھیں جھیل رہا ہوں۔

یہ ہے میری زندگی جسے گزارنے کے قابل پایا جو اگر دوبارہ مجھے پیش کی جائے تو میں بخوشی اسے اسی طرح گزاروں گا۔"

لارڈ جان رسل کا پوتا لارڈ منٹو کا نواسہ انگلستان کے ٹاپ ٹین خاندانوں سے ایک کا فرد برٹرینڈ رسل جسے وہ عزت و آبرو بغیر کچھ کیے ورثے میں ملی تھی جو اوروں کے لیے باعث رشک اور ان کا مطمع نظر ہے، اس نے ٹھکرا دی۔ اپنا مقام آپ پیدا کیا جو اس کے خاندان کے کسی بھی دوسرے لارڈ کو حاصل نہیں ہوا۔ وہ بھی اپنے زمانے کا گوتم تھا۔ گوتم کی طرح وہ بھی خدا کی ہستی کا اقرار کنندہ تھا نہ

انکار کنندہ۔ گوتم بدھ مت کا بانی تھا، ہمارے دور کا یہ گوتم کسی دین کا پیرو نہ ہوتے ہوئے بھی مرادی معنوں میں مذہبی نہ سہی مزاجاً مذہبی آدمی تھا نوع انسانی کے بے پایاں دکھوں پر کڑھنا، ان دکھوں کے مداوے کی طلب و تلاش اور یہ امید کہ کبھی نہ کبھی انسانی معاشرہ ایسی سطح پر پہنچ سکتا ہے جسے سنہری دور یا جنت ارضی کا نام دیا جاسکے گا۔ پوری نسل انسانی کو ایک وسیع برادری خیال کرنا رنگ نسل اور قوم پرستی، نیشنلزم کو لعنت سمجھنا، کسی بھی قوم کے قومی ترانے کو قومی جھوٹ کا پلندہ جاننا، امن و مساوات کی تبلیغ ہی تو وہ اعلیٰ آدرش ہیں جن کی سارے مذاہب درس دیتے ہیں۔

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرۂ درد دلے عطار را

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

.....

فریدالدین عطا اور الطاف حسین خالی کے یہ اشعار جو ہر دین ہر مذہب کا جوہر (quint essence) ہیں، اگر کوئی دیندار اسے پالینے سے محروم ہے تو وہ دیندار نہیں دنیادار ہے۔

برٹرینڈ رسل متشکک تھا متذبذب نہیں تھا۔ تذبذب اور تشکک دو مختلف رویے ہیں اور دونوں فائدے سے خالی نہیں۔ تذبذب کی بنیاد خوف پر ہے اور تشکک کی بنیاد حصول حق کی خواہش اور کوشش۔ متذبذب کو:

کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

.....

کی وجہ سے احتیاط کی حالت درپیش اور تشکک سخت پیغمبری۔ حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ اس کی مثال۔ اس دور میں ہائی مذہب رائج تھا اور اجرام فلکی معبود تھے۔ ہر معبود کا بت معبدوں میں رکھا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا چاند غروب، سورج غروب تارے غروب اجرام فلکی سب کے سب آفلین، کوئی ہمہ وقت موجود نہیں، جو ہمہ وقت موجود ہونا چاہیے کوئی اور ہے اور وہ جو کوئی ہے وہی موجود حقیقی اور معبود حقیقی ہے۔ لا الہ الا اللہ۔ برٹرینڈ رسل سے پوچھا گیا کہ مرنے کے بعد اپنے آپ کو خدا کے سامنے پاؤ تو کیا کہو گے تو کہا

I should say: God! why did you make the evidence of your existence so insufficient.

یہ نہیں کہا کون خدا، کہاں کی قیامت کیسا سوال و جواب بلکہ یہ کہا کہ شہادت ناکافی تھی۔ خدا حشر و نشر اور حساب کتاب کا انکار نہیں کیا۔ اس کا موقف وہی تھا جو ابراہیم بن ادہم، کا تھا۔

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

☆☆☆☆☆

جلترنگ_ بچوں کی نظمیں [کرامت بخاری کی تخلیقی ہنرمندی]

شعروادب میں جو کچھ ملے گا اس میں بیشتر حسن و عشق کے موضوعات سے متعلق پڑھنے کو ملے گا جب کہ معاشرے میں بچوں کی تعداد بڑوں سے کم نہیں لیکن ان کے لیے کم بہت کم لکھا گیا دوسرے معیار بھی وہ نہیں جو بچوں میں بہتر زندگی بسر کرنے اور آگے بڑھنے کے تصور کو مہمیز کر سکے۔ وہ کہانیاں ہوں، فرضی قصے ہوں یا جنوں پریوں کے واقعات ہوں، ان سب میں دلچسپی ضرور ہوگی مگر جذبۂ مسابقت کی فروغ پزیری کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوگا، اسی طرح شاعری میں بچوں کے لیے جو کچھ لکھا گیا وہ قدرے بہتر ضرور ہے مگر اسماعیل میرٹھی اور صوفی تبسم کے علاوہ کوئی بڑا نام سامنے نہ آسکا۔ بچوں پر لکھی ہوئی نظمیں مشاہدے میں آئی ہوئی اشیا اور قدرے مزاحیہ انداز کا پَرتو دکھائی دیتی ہیں؟ بچوں کی نفسیات اور ان کی معصومانہ اداؤں کا گہرائی سے مشاہدہ کرنا آسان نہیں، دوسرے ان کے لیے آسان عام فہم اور مترنم نظم تخلیق کرنا ہر شاعر کے اختیار میں نہیں، اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ کالج کے طلبا کو پڑھانے والا استاد کسی پرائمری سکول کے بچوں کو پڑھانے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ بچوں کے سامنے گفتگو کرنا اور ان کی توجہ برقرار رکھنا قدرے دشوار طرز عمل ہے، اس کا امکان ہے کہ بہت پڑھا لکھا اور ذہین استاد ناکام ہو جائے اور بچے اس کے لیکچر کو سمجھنے سے قاصر ہوں اس لیے بچوں کی سطح پر آ کر

حسن عسکری کاظمی

ان کی رہنمائی کرنا یا ان کے لیے کوئی نظم تخلیق کرنا منفرد تخلیقی ہنرمندی کہلائے گی۔ اس وقت ہمارے سامنے بچوں کی نظمیں ''جل ترنگ'' کی صورت میں دعوت اظہار دے رہی ہے جسے کرامت بخاری نے ترتیب دیا اور خود سرورق پر بچے معصومانہ انداز میں اچھل کود کرتے دکھائی دے رہے ہیں جو بلند بالا چاند کی طرف ہاتھ اُٹھائے اسے پکڑنا چاہتے ہیں۔ ''جلترنگ'' میں بھرپور موسیقیت کا استعارہ بڑے قارئین کو بھی پسند آئے گا۔ یہ نظمیں چھوٹے بڑے بچوں میں مقبول ہو سکتی ہیں اور کرامت بخاری کے بقول ''بچوں کے لیے بہت کم کم لکھا گیا ہے اور جو لکھا گیا ہے اس میں مقصدیت، معنویت اور کردار سازی کے موضوعات کا اتنا خیال نہیں رکھا گیا جتنا آج کے ماحول کی ضرورت اور مستقبل کا تقاضا ہے'' بچوں کی نظموں میں عقیدۂ توحید کو پختہ تر کرنے کا خیال اور اللہ تعالیٰ کی حکمت عملی کے نتیجے میں چاند، سورج، زمین اور آسمان، ستارے اور سیارے، کہکشاں اور قوسِ سماء غرض ہر چیز جو وجود رکھی ہے وہ خالق کی معرفت کا بنتی ہے، کرامت بخاری نے ''جل ترنگ'' میں حمدیہ نظموں سے آغاز کیا اور بچوں کے لیے سادہ اور روزمرہ استعمال میں آنے والے لفظوں سے بنت کاری کا ہنر پیش کیا۔ فہرست میں حسن ترتیب پر خاص توجہ کی ان کی اور نعت، میلادِ مصطفیٰ، ارض وطن، کشمیر اور نغمۂ کشمیر جیسی بامقصد نظمیں بچوں میں وطن دوستی اور تاریخ وطن سے دلچسپی کی خاطر قائداعظم، چودہ اگست، دریا اور کہسار ہمارے اور پاکستان ہے پاکستان لکھ کر اس خلا کو پُر کیا جو اب تک موجود تھا۔

کرامت بخاری نظم نگاری میں اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں، ان کا اپنا بچپن اور لڑکپن دور ایک ایسے گاؤں میں گزرا جہاں بچوں کے پاس کھلونے کم ہوتے تھے مگر وہ خود روایتی کھیل کھلونوں سے جی بہلاتے رہے مثلاً آئیں بائیں شائیں، پتلی تماشا، طوطا، گڑیا کی نانی، چندا ماموں اور بچوں کی ایک ٹولی اور ایسی نظمیں ہیں جو بچوں کو پسند ہیں، گاؤں میں گلی ڈنڈا کھیلا جاتا ہے یا کھیتوں میں مولی گاجر، پالک، گوبھی اور چقندر یا ٹماٹر کھانے کا اپنا لطف ہے۔ کرامت بخاری نے بچپن کی یادوں کو سامنے رکھ کر ایسی نظمیں تخلیق کیں جو دل میں گھر کرنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں مقصد غالب ہے مگر فن بھی اپنی معراج پر نظر آتا

ہے ان کا یہ کہنا بجا ہے کہ:

"آج ہماری درس گاہیں بچوں کے لیے امتحان ضروری خیال کرتی ہیں مگر انھیں زندگی کے لیے تیار نہیں کرتیں۔ آج کی مائیں بچوں کو نوکروں اور Play Land کے حوالے کر چکی ہیں جب کہ ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہے"

جلترنگ ایک کامیاب فکری کاوش ہے اور اس مختصر مگر جامع کتاب میں 67 نظموں کا یکجا ہونا دوسرے شاعروں کے لیے ایک تحریک سے کم نہیں کہ وہ بھی بچوں کے لیے بامقصد نظمیں لکھیں جو ان کے روشن مستقبل کی ضمانت فراہم کر سکیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں کے لیے لکھنا خود کو بچوں کی نفسیات سے مکمل طور پر آگہی حاصل کرنے سے عبارت ہے۔

زندگی کی ضرورت کو پورا کرو
کوئی کام بھی نہ ادھورا کرو
بس یہی بات سب کو سناتے چلو، گیت گاتے
چلو مسکراتے چلو

.....

کرامت بخاری کو اپنی روایات عزیز ہیں، وہ اپنی سرزمین اور مملکت خداداد پاکستان سے محبت کرتے ہیں ان کی خواہش ہے کہ ہمارے بچے بھی دل و جان سے پاکستان سے پیار کرنا سیکھیں، آزادی بہت بڑی نعمت ہے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ہم نے یہ ملک حاصل کیا۔ بچوں کے لیے نظموں میں یہ پیغام موجود ہے کہ اس ملک کی حفاظت کرنا ہم پر فرض ہے، کرامت بخاری نے قائداعظم کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جو اوصاف بیان کیے بچوں کو آسانی سے یاد ہو جائیں گے:

وہ شرافت میں اور ذہانت میں
اور مشہور تھا وکالت میں
میرا قائد تھا اور رہبر تھا
اس کو قانون سارا ازبر تھا

.....

اس طرح کرامت بخاری نے سرزمین پاک کے موسموں کو متعارف کرانے میں بچوں کی ذہنی سطح کو پیش نظر رکھا، برسات، گرمی، سردی اور بہار پر کمال نظمیں تخلیق کیں اور ان کے عنوان دلوں کو لبھاتے ہیں جیسے برکھا رت آئی، کالے بادل آئیں۔ ساون، موسم بہار، جون کا مہینہ، موسم گرما:

لو آ گیا ہے بچو پھر جون کا مہینہ
بہنے لگا ہے سر سے پاؤں تلک پسینہ

.....

موسمی تہوار اور اسلامی تہوار ہماری اجتماعی

زندگی میں جتنی اہمیت رکھتے ہیں اس کا اندازہ بچوں کی دلچسپی سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ تہوار شہروں اور دیہات میں بھرپور طور پر منائے جاتے ہیں۔ امیر اور غریب بچوں کی خوشی میں اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ کرامت بخاری کو اپنا بچپن بھی یاد آ گیا اور گاؤں میں سب بچوں کے ساتھ مل کر کھلے میدان میں بڑوں کے درمیان مختلف مقابلے دیکھنا، نیزہ بازی، کبڈی، کشتی اور دوسرے دیہاتی کھیل یا کوئی اور تماشا دیکھنا نہیں بھولے، اسی طرح گرمیوں کی چھٹیوں میں عزیزوں کے ہاں جانا اور وہاں اودھم مچانا یاد آتا ہے، یہاں بھی وہ بچوں کو پڑھائی کی اہمیت کے پیش نظر نصیحت کرنا نہیں بھولے:

بھاگو کودو، باگو دوڑو، ہر دم سیر کو جاؤ
لیکن لکھتے پڑھتے رہنا بچو صبح و شام
دیکھو وقت گزر نہ جائے اس کا رہے دھیان
بے کاری میں بیت نہ جائیں چھٹیوں کے ایام

.....

کرامت بخاری کی ایک نظم ''آؤ وعدہ کریں'' یہ نظم پہلے استاد سمجھے پھر شاگردوں کو سمجھائے، نظم عمدہ ہے مگر بچوں کے لیے معانی بھی بتائے جائیں۔ اس نظم میں مقصدیت کے علاوہ اعلیٰ درس کا در بھی کھولا گیا ہے لیکن یہ نظم بڑے بچوں کو بھی سمجھنے میں دقت محسوس ہو گی۔ اس نظم کے قوافی قدرے مشکل اور نادر ہیں مثلاً:

سال نو آ گیا سال نو کے لیے عزم نو بھی تو ہو
آؤ وعدہ کریں اور وعدوں کا پھر سے اعادہ کریں
علم و حکمت کی باتیں جہاں بھی ملیں اور جیسے ملیں
دنیا بھر کے تجربات و حالات سے استفادہ کریں

.....

ایک نظم صوفی تبسم کے ٹوٹ بٹوٹ کی طرح لکھی گئی، 'گویا' ایسی پیاری نظم ہے کہ پنجاب کے بچے اسے گاتے پھریں گے۔

گلی گلی میں جائے_ لے کر ہاتھ میں باجا_
بھاگے بھاگے آئیں_ گاما ساجھا ماجھا_
نتھو تھو سارے_ چھوڑ کے کاما کاجا_ یوں
اترائیں جیسے_ راج کوٹ کا راجا_
سارے مل کے گائیں_ آجا بالم آجا_
گیت گویا گائے_ لے کر ہاتھ میں باجا

.....

مختصر یہ کہ ''جلترنگ'' بچوں کی نظموں پر مشتمل ایسی بیاض ہے جو دین اور دنیا دونوں میں بچوں کی من پسند کہلائے گی اور کرامت بخاری کی نغمہ زار نظمیں بچوں کے دلوں میں قوس قزح کے رنگ اور گلہائے صد رنگ کی خوشبو بکھیرتی رہیں گی۔

☆☆☆☆☆

شفقت حیات کی تصویر کب مکمل ہوگی؟

ٹیکسلا سے تعلق رکھنے والی شاعرہ شفقت حیات کے شعری مجموعے کا نام ''میری تصویر نامکمل ہے'' اس بات کا اعلان نامہ ہے کہ وہ اس تصویر کو مکمل کرنا چاہتی ہیں، شفقت حیات کے اسی اعلان نامے کی روشنی میں اُس کی کتاب کا ایک طائرانہ یا نقادانہ جائزہ لے کر یہ رائے دی جاسکتی ہے کہ وہ اس نامکمل تصویر کو مکمل کرنے کی کوشش میں کہاں تک کامیاب رہی ہے یا رہے گی۔ اُس کے ایک شعر سے تصویر نامکمل ہونے کی وجہ معلوم ہوتی ہے :

مری تصویر کی آنکھوں سے آنسو کیوں نہیں بہتے
ترے شہکار کو دنیا سمجھتی ہے مکمل کیوں

.....

تکمیلیت یا عدم تکمیلیت کے پس منظر میں اُس کے یہ شعر اُس کے دل کے واردات کی ترجمانی بہت واضح طریقے سے کر رہے ہیں:

خواب دیکھا تھا جو مکمل تھا
اس کی تعبیر نامکمل ہے

تو جو آئے تو اس میں رنگ بھرے
میری تصویر نامکمل ہے

جسم حاصل ہوا ہے روح نہیں
تیری تسخیر نامکمل ہے

.....

معروف شاعر اور نثّار جناب سلمان باسط اندرون سرورق اپنے فلیپ میں لکھتے ہیں ''شاعری-- نہ نصابی اور نہ ہی اکتسابی شے ہے- یہ تو بس مالکِ کُل کی دین ہے جسے چاہے عطا کر دے اور اس کا اندر باہر لشکا دے -- شفقت حیات بھی انہی خوش نصیبوں کی لڑی میں سے ہیں- ہر شاعر کی طرح انہوں نے بھی اپنی سوچوں کا سِرا پکڑ کر وجدان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اور حروف کے تال میل سے وہ سب کچھ یکجا کر دیا ہے جسے نِرمل کومل سُروں میں ڈھل جانے والی شاعری کہا جاتا ہے--''

نسیمِ سحر

شاعرات جہاں ادب کی ''مین سٹریم'' میں شامل ہوتی ہیں وہیں اُن کی ایک اور جہت بھی ہوتی ہے اور وہ ہے اُن مسائل کی نشان دہی یا اُن پر بلند بانگ یا خاموش احتجاج جن سے اِس مرد معاشرے میں مرد کی مختلف حیثیتوں سے انہیں واسطہ پڑتا ہے۔ ماضی بعید و قریب میں کشور ناہید، عذرا عباس، پروین شاکر، سارا شگفتہ اور کچھ دیگر شاعرات نے اِس کا اظہار اپنے اپنے انداز میں واشگاف یا دبے لفظوں میں کیا ہے۔ مقام شکر ہے کہ ایسی معدودے چند شاعرات کی فہرست میں اب شفقت حیات بھی شامل ہوگئی ہے، اُس کا ایک شعر دیکھیے جس میں اُس نے کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا ہے:

دل ہے ضد پر سمجھ رہا ہی نہیں
سو مسائل ہیں عورتوں کے لیے

.....

مگر مرد معاشرے میں اُسے ایک ماں کے طور پر یہ کہنے کی بھی ہمت اور جرأت ہوگئی:

پہلے ڈرتی تھی اک پتنگے سے
ماں ہوں اب سانپ مار سکتی ہوں

.....

یہ شعر جہاں ماں کے کردار کی وضاحت کرتا ہے وہیں یہ اشارہ بھی کرتا ہے کہ معاشرے میں جگہ جگہ سانپ پائے جاتے ہیں جن سے پہلے وہ صرف کنارہ کشی کرتی تھی، اب بیٹے کی محبت میں اُس میں اتنی جرأت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ ان سانپوں کو مار بھی سکتی ہے۔ یوں جانیے کہ یہ شعر مرد معاشرے میں عورت کو درپیش مسائل کی سمت نمائی بھی کرتا ہے۔ اور اسی ماحول میں اپنے حوصلے اور استقامت کا اظہار وہ یوں کرتی ہے:

کوئی بتلائے ٹوٹی ہوں کہاں سے
تو خود کو جوڑ لوں گی میں وہاں سے

.....

شاید انہی مسائل اور مردانہ حاکمیت والے معاشرے کے دیگر مسائل کے سبب شفقت حیات زیادہ تر گھر کی چار دیواری میں رہ کر اچھی اور تخلیقی شاعری کر رہی ہے۔ وہ غزل اور نظم دونوں میں اپنا بھرپور اظہار کر رہی ہے۔ اسے مسلسل مطالعے اور فنی ریاضت کے سبب مصرع بنانا بھی آگیا ہے، لفظ کے استعمال کا سلیقہ بھی اور لفظی تراکیب کا قرینہ بھی۔ دیکھیے اِس حمدیہ شعر میں کس کمال سے اس نے 'دھڑکن کا ورد' کی ترکیب استعمال کی ہے:

نام خدا ہی اب مری دھڑکن کا ورد ہو
میں جانتی ہوں زندگی جھونکا ہوا کا ہے

.....

شفقت حیات عورت کی محبت اور مرد کی محبت میں وفا اور جفا کے معاملات کی خلیج کو یوں واضح کرتی ہے:

تم ہمارے نہ رہے اور کسی کے ہو کر
ہم کسی اور کے ہو کر بھی تمہارے ہی رہے

.....

کسی نے یاد دلایا تو یاد آیا اسے
ذرا سی دیر ہوا شرمسار ، بھول گیا

.....

کسی شاعرہ کو محض اُس شاعری کے پیمانے سے جانچا نہیں جا سکتا جو اُس نے خالص نسائی موضوعات پر کی ہے، شفقت حیات کے بہت سے شعر نسائی معاملات و مسائل پر ہیں، تاہم یہ اُس کی مجموعی شاعری کا محض ایک جزو ہیں، اِس انداز کے چند شعر اُس کی جزوی ترجمانی کرنے کے باوجود مجموعی شاعری کے کُل میں پورے طور سے شامل ہیں، یہ شعر ملاحظہ ہوں:

آنچل کو جیسے پھینک کے کیکر پہ کھینچ لے
ایسے اڑائیں دھجیاں میرے یقین کی

دوپٹہ ہی نہیں مجھ سے سنبھلتا
میں اپنے آپ کو کیسے سنبھالوں

.....

لیکن یہ کومل لہجے کی شاعرہ کبھی کبھی بوجوہ ایک جارحانہ موڈ میں یوں بھی کہتی ہے:

نشانے دل پہ لگانے مجھے بھی آتے ہیں
ہوا میں تیر چلانے مجھے بھی آتے ہیں

یقین رکھتی نہیں ہوں کسی فریب پہ میں
وگرنہ ہاتھ دکھانے مجھے بھی آتے ہیں

زمانے، تیری اداکاریاں سمجھتی ہوں
یہ جھوٹے اشک بہانے مجھے بھی آتے ہیں

.....

مکالماتی شاعری بھی تخلیقی زرخیزی اور فنی گرفت کا ایک پیمانہ ہوتی ہے، اور شاید اس ہنر وری کے ضمن میں بہت کم شاعرات کا نام لیا جا سکتا ہے - شفقت حیات کی مکالماتی شاعری کے انداز بتا رہے ہیں کہ وہ اس جہت سے بھی اپنی نمایاں پہچان بنانے کے سفر پر چل پڑی ہے:

وہ بیچ بھنور چھوڑ کے کہنے لگا مجھ سے
ساگر کا بتاؤ کہ یہ گہرا تو نہیں ہے
اُجڑی مری دنیا تو بڑے پیار سے پوچھا
شفقت تجھ مجھ سے کوئی شکوہ تو نہیں ہے

.....

اِس انداز کی مکالماتی شاعری میں وہ پروین شاکر سے متاثر نظر آتی ہے اور اُسی کی طرح

کہیں کہیں اُس کا لہجہ تلخ اور بے باک بھی ہو جاتا ہے:

تم کوئی مجھ سے محبت کے لیے آئے ہو
تم تو بس اپنی سہولت کے لیے آئے ہو

جانتی ہوں کہ نہیں آئے ہو تم میرے لیے
تم فقط اپنی ضرورت کے لیے آئے ہو

اس دکھاوے کی محبت سے مجھے باز رکھو
لوگ سمجھیں گے کہ شفقت کے لیے آئے ہو

.....

یہاں مَیں اس کی ایک مختصر بحر کی مکالماتی اور سوالیہ انداز کی غزل کے کچھ شعر ضرور پیش کروں گا جو اس نے جون ایلیا کی نذر کی ہے، اور اسی کے انداز میں ہے:

دل کسی اور سے لگاؤں کیا
کیا کہا ، تم کو بھول جاؤں کیا؟

تم نے اپنا بنا لیا ہے تو میں
گھر کسی اور کا بساؤں کیا
میں جو کہتی تھی تجھ پہ مرتی ہوں
اب تجھے مر کے بھی دکھاؤں کیا

.....

اِسی طرح ردیفوں کی جدت اور ندرت نے بھی اس کی شاعری میں معیاری اور تخلیقی رفعت پیدا کی ہے، ایسی عمدہ ردیفوں میں تو سہی، بتاؤ پہلے، اور بس، خوش ہے جیسی مختصر ردیفوں کے ساتھ ساتھ آج بھی شام ڈھل گئی، تو ایک دنیا پڑی ہوئی تھی جیسی طویل ردیفیں بھی شامل ہیں جو اُن کی شاعری کو مزیّن اور منوّر کر رہی ہیں، ان خوبصورت ردیفوں والے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

میں تجھے آنکھ میں چھپا لوں گی
تو کبھی خواب بن کے آ تو سہی

حیرت سے دیکھتا ہے حیاتؔ آئنہ مجھے
اس میں ذرا سا خود کو سنوارا ہے اور بس

تبھی محبت کی ابتدا ہو، تبھی محبت کی انتہا ہو
میں عشق جو بار بار کرتی تو ایک دنیا پڑی ہوئی تھی

.....

جس طرح شعری کائنات شعراء اور شاعرات کو الگ الگ کمپارٹمنٹ میں رکھنا پسند نہیں کرتی، اسی طرح شاعری کو بھی غزل کی شاعری اور نظم کی شاعری میں بانٹا نہیں جا سکتا، تخلیقی شاعر یا شاعرہ کو غزل اور نظم دونوں پر عبور ہوتا ہے، لیکن دیکھا ہے کہ زیادہ تر شعراء یا شاعرات اپنا بہتر تخلیقی اظہار غزل یا نظم میں سے کسی ایک صنف

میں ہی کرتے ہیں۔ اس پیمانے سے جب میں نے شفقت حیات کی نظمیں پڑھیں تو خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ اُس کی نظمیں بھی غزل کی طرح معیار اور تخلیقیت کی حامل ہیں۔ نظم کا اقتباس پیش کیا جانے سے پوری نظم کا ابلاغ نہیں ہوتا، تاہم اس کی ایک نظم ''اُس نے سچ ہی کہا تھا مجھے'' کا ایک اقتباس ایسا ہے کہ اسے سننے والا پوری نظم کا ابلاغ اپنے تخیل کے ذریعے کر سکتا ہے:

میں نے مڑ کے جو دیکھا تو میں / واقعی / ایک پتھر کی مورت بنی دیکھتی رہ گئی / کوئی تھا ہی نہیں / اُس نے سچ ہی کہا تھا مجھے / پیچھے مڑ کر نہ تم دیکھنا / ورنہ پتھر کی ہو جاؤ گی۔

شفقت حیات کی اس پہلی کتاب پر ابھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن یاد رہے کہ پہلی کتاب آخری کتاب نہیں ہوتی اس لیے اس کی تنقید و تحسین بھی حتمی نہیں، ابتدائی ہوتی ہے، اور پہلی کتاب پر جو کچھ کہا جاتا ہے وہ مستقبل کے امکانات کی نشان دہی تو کرتا ہے لیکن مستقبل میں کوئی تخلیق کار کہاں تک آگے کا سفر کرتا ہے اس کا علم کسی ٹائم مشین کے ذریعے لمحۂ موجود میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے مستقبل بینی کی کوشش کیے بغیر میرا اُسے یہی مشورہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھے، کتاب اور جرائد ہی اُس کی پہچان کا ذریعہ بنیں گے۔ کیونکہ مشاعروں کی جھوٹی سچی داد کے برعکس کسی شاعر کا تخلیقی قامت، شہرت اور مقبولیت کا گراف اُس کی اس شاعری سے بڑھتا ہے جو کاغذ پر اپنی اور اُس کی زندگی کا ثبوت دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُسے اس شعر: ''تم جو آؤ تو اس میں رنگ بھرو : میری تصویر نامکمل ہے'' کہنے کی بجائے اپنی تصویر میں اپنے ہی رنگ بھرنے چاہئیں کہ وہی اس کی شعری بقا کا ثبوت ہیں۔ میں نے اس مضمون کا عنوان رکھا ہے'' شفقت حیات کی تصویر کب مکمل ہو گی؟'' اس سوال کا جواب بھی میں خود ہی دے رہا ہوں کہ یہ تصویر صرف اُس روز مکمل ہو گی جب شفقت حیات کی شاعری مکمل ہو گی۔ اور یارو، ظاہر ہے ایسا دن کبھی نہیں آتا کہ کسی تخلیق کار کی شعری کائنات مکمل ہو جائے، کیونکہ اس کائنات میں تو بقول علامہ اقبال'' آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون''۔ شاعر کی عمر اور ریاضت کے ساتھ اُس کی شاعری مسلسل آگے بڑھتی رہتی ہے اور یقیناً یہی کچھ شفقت حیات بھی محسوس کر رہی ہو گی۔

☆☆☆☆☆

''صداقت پر شاہد ناطق''

رانا محمد شاہد نے اپنے وجود میں مضمر ذات کو لفظ کی نامیات سے جوڑ کر نشو ونما کے جادے کو اپنایا ہے اور ایسا ہونا کسی اتفاق کا شاخسانہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہاں شعور کا نور اپنی توانائی کے ساتھ موثر ہوا ہے۔

یہ تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ ''اخبار کا رومان'' آج کے اس سریع الرفتار عہد میں جن دو چار اصحاب کا ''مسئلہ'' ہے تو ان میں ہمارے اس عزیز کے نام کو بالیقین شامل کرنا ہوگا! یہ پہلو ذاتی طور پر میرے علم میں ہے کہ ایک سے زائد روزناموں کے متون کو اپنی کلیت کے ساتھ ان کی آنکھیں جب تلک خواندگی سے گزار نہیں لیتیں، زیست کا سکون ان سے فاصلے پر منڈلاتا رہتا ہے۔ اس طرح ملکی حالات، سیاسی جذر و مد، عالمی وقوعے، معلومات عامہ، شوبز، ادب، اصلاحی فیچرز------ سمیت سب ان کے لیے وقیع ٹھیرا! یہ امر باعث مسرت ہے کہ اخبار سے اپنی پہلی محبت سے دستکش ہوئے بنا انھوں نے سنجیدہ ادبی جرائد اور موقر علمی کتب کے سرچشموں سے بھی انسلاک کو اپنے لیے بروقت ممکن بنا لیا۔ جس کا صلہ یہ ہے کہ اب وہ باقاعدہ ادبی رسائل میں اپنی تحریروں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

رانا محمد شاہد کے لیے یہ امتیاز بھی خاص رہے گا کہ وہ ان جواں سال لکھنے والوں میں بہر صورت نہیں ہیں جنھیں بلا واسطہ لکھنے کا ''اعزاز'' ملا ہے۔ انھوں نے طویل اور مشکل راستے کا چناؤ کیا کہ پہلے پڑھا، بہت زیادہ پڑھا، پھر قلم اور قرطاس کے رشتے کی استواری کو اذن عمل دیا۔ وگرنہ اس دور میں ''کاتا اور لے دوڑی'' کی روش عام ہے۔ اس ضمن میں سرعت کو عارضہ بنانے میں سوشل میڈیا کا کردار کسی صاحب النظر سے اوجھل نہیں ہے۔ یہ مشاہدہ کر کے تحیر زا انبساط کا احساس ہوتا ہے کہ شاہد فیس بک وغیرہ پر بہت ہی کم ظہور کرتے ہیں، یوں اپنے لکھے کی نمود کے لیے یہ کبھی اتاولے نہیں ہوئے۔ ایسی مصابرت آج کم کم نظیریں ہی دستیاب کر پائے گی!

یہ اسی صبر و ریاضت کا صلہ ہے کہ قدرت نے ان کے قلم کو تجزیے کے اعماق عطا کرنا شروع کر دیے ہیں۔ اس ضمن میں: ''طناب فکر'' اولین حوالہ بننے جا رہی ہے۔ اس مجموعہ اوراق میں مصنف نرگسیت سے کوسوں دور ہے یعنی اپنی رائے کو بلا شرکت

جمیل احمد عدیل

غیرے پیش کرنے کا خبط کہیں نہیں ملے گا بلکہ قابل ذکر اور ثقہ معاصرین کے نقطہ ہائے نگاہ سے استفادے کا رجحان اپنی گواہی رقم کرنے پر اصرار کرتا دکھائی دیتا ہے لیکن مقتبس عبارات سے تحریر کے حجم کو فروغ دینے کے بجائے امتزاج کاری کو عملیہ بنانے کا میلان مسلسل موجود ہے اور یہ طرف ان کی فکری ذہنی بلوغت کی دلیل ہے۔ اس میں تو کلام نہیں کہ شاہد تخیل کی سطح پر عنوان کے تقاضے کو نبھاتے ہوئے ایک تھیسز تو ابتدا ہی میں تشکیل دے لیتے ہیں مگر اسے "موضوع" کے سنگ گراں تلے سسکنے نہیں دیتے۔ وہ اچھی طرح باخبر ہیں کہ یہ "معروض" ہے جو قارئین کے بیچ مشترک ہے چنانچہ وہ ایک موقف کے دیے سے دوسرے موقف کا دیا جلاتے چلے جاتے ہیں۔

"طناب فکر" کے خالق کو ایسا عصبی خلل بھی لاحق نہیں کہ وہ تائید کی فضا میں ہی اپنے قلم کو رواں پائیں، وہ پوری جرات کے ساتھ اختلاف کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ یہ اسی آزاد صورت حال کا فیضان ہے کہ بطور قاری راقم کو بھی ان کے بعض بیانیوں سے متفق نہ ہونے کی تحریک میسر آئی۔ واضح رہے کہ یہ جگہیں اکا دکا ہی ہیں۔ البتہ یہ طے ہے کہ شاہد برہان سے خود بے نیاز ہوتے ہیں نہ فریق مخالف کو یہ حق دینے پر تیار ہیں۔ ایسے میں لکھے ہوئے کی معنویت اور وقعت مصنف کا اجر بن جایا کرتی ہے۔ شاہد بھی اس معتبر اجر سے محروم نہیں رہے۔ اس کتاب میں شامل کالموں پر ان مضامین کو ترجیح حاصل ہے جن میں وہ قدرے تفصیل کی جانب گئے ہیں۔ یقیناً وہ جانتے ہیں کہ مجمل تحریر کبھی کبھی تاثر کے دائرے کو ادھورا بھی چھوڑ جایا کرتی ہے اسی لیے وہ جہاں قریب اور دور کے زاویوں کو متعدد اکناف کے ہمراہ سمیٹنے کی مشقت میں مبتلا ہوئے ہیں وہاں قاری کے لیے مقامات تفکر غالب ہیں۔ ان مضامین کا تنوع پر لطف ہے کہ وہ دھرم عقیدے کی بات بھی کرتے ہیں، سیاست کاروں کے "خفیہ کاروں" کو بھی طشت از بام کرتے ہیں۔ وہ زمینی مسائل جو اکثریت کی تقدیر بنے ہوئے ہیں، ان کی بابت حلات بھی تجویز کرتے ہیں۔ بعض احوال کو بیان کرنے کے لیے شاہد نے "واحد متکلم" سے بھی کمک حاصل کی ہے۔ آخر فرد کا اپنا وجود بھی تو تجربے کی ماہیت کو سہتا ہے! شاہد جن لوگوں سے ملے، جن تقریبات کا حصہ ہوئے، ان کی روداد بھی تحریر میں خوبی سے جذب کر لیتے ہیں لیکن بھٹکتے نہیں ہیں کہ موضوع کی منزل پر اپنی توجہ مرتکز رکھتے ہیں۔

آخر میں یہ اظہار ضرور کرنا ہے کہ انھوں نے اپنی خالص ادبی نوعیت کی تحریریں اس مجموعے میں شامل نہیں کی ہیں۔ یہ میرے لیے خلاف توقع تھا لیکن پھر سوچا تو یہ خیال آیا کہ ممکن ہے وہ ان نگارشات کو الگ سے ترتیب دے رہے ہوں تاکہ ان کا علاحدہ تشخص قائم رہے! لیکن یہ وصف کی بات ہے کہ اس کتاب کے مشتملات میں ادبی اسلوب سے وہ کنارہ گیر نہیں ہوئے! "طناب فکر" میں مصنف نے عنان برابر اپنے ہاتھ میں رکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ تحریر ایک مجاہدے کے بعد ہی اپنے داخلی صدق پر شاہد ناطق ہوا کرتی ہے!!

☆☆☆☆☆

یوسف عالمگیرین کا پنجابی شعری مجموعہ ''سفنے''

ممتاز شاعر، ممتاز ادیب، کالم نویس، عسکری تجزیہ نگار اور دانش ور یوسف عالمگیرین ادبی افق پر عالمگیر بن چکے ہیں۔ نیشنل بُک فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام کتاب میلہ میں اُن سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ اُن کی شخصی عظمت، اُن کے قد سے کہیں بلند ہے۔ ہر اہلِ قلم سے محبت کرنا اُن کی سرشت میں شامل ہے جس طرح روح بالیدگی کے لیے ٹھنڈی اور تازہ ہوا ضروری ہوتی ہے اِسی طرح دوستوں کی محبت کشید کر کے یوسف عالمگیرین تر و تازہ رہتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں مختلف موضوعات پر قلم اُٹھانے والے صاحبِ ذوق غیر معمولی شخصیت کے حامل ہیں۔ وہ علم و ادب کی سیرابی کے لیے ہمہ وقت مصروفِ عمل ہیں۔ پاک فوج کے مجلّہ ''ہلال'' کا اُردو حصہ اُن کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا ایک آئینہ ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اُن کی پنجابی، اُردو تحریر اَدب سے گہری وابستگی اور ریاضت کا اظہار ہے۔ دوسروں کے دلوں میں گھر کرنے والے اتفاق سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جو دوسروں کو احترام کے پرچم پر آویزاں کرتے ہیں وہ لامحدود وسعتوں پر لہرانے لگتے ہیں۔ اساتذۂ کرام سے اکتسابِ فیض کو وہ بہت بڑی نعمت تصور کرتے ہیں۔ اُن کا پنجابی شعری مجموعہ ''سفنے'' یوں تو 125 صفحات پر مشتمل ہے لیکن فکری گہرائی کے اعتبار سے بہت ذرخیز ہے۔ قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے عبدالستار عاصم نے ایسے 2018ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ مردِ درویش حضرت جبار مرزا اور معروف شاعر و ادیب زاہد حسن کے تاثرات نے کتاب کی اہمیت پر مہر لگا دی ہے۔ جس طرح وہ حالاتِ حاضرہ اور زندگی کے گھمبیر مسائل پر اشہب قلم قرطاس پر دوڑاتے ہیں، اِسی طرح اپنی شاعری میں واقعات کو بھی بڑے سلیس انداز میں ڈھالنے کا فن جانتے ہیں۔ پنجابی چوں کہ مجموعی طور پر صوفیہ کرام کی زبان تصور کی جاتی ہے۔ اِسی لیے ''سفنے'' میں کئی

ہارون الرشید

موضوعات معارفت کے رنگ میں موجود ہیں۔ غزلوں کا سفر صفحہ 19 سے 48 پر مشتمل ہے جب کہ صفحہ 49 سے 120 تک مختلف موضوعات پر نظمیں خوطہ زن ہیں۔ یوسف عالمگیرین کا کمال ہے کہ وہ من کی دنیا کا اظہار عجز و انکساری سے کرتے ہیں۔ شاید اُن کے بارے میں ہی خورشید سخن ڈاکٹر خورشید رضوی نے کہا ہے:

ہو سکے خورشید تو کچھ یوں بسر کر جایئے
دل خدا کے ساتھ ہو، پیکر جہاں کے ساتھ ساتھ

دشتِ اَدب میں منکسرالمزاج یوسف عالمگیرین پاکستان سے دلی محبت کرتے ہیں۔ اُن کا ہر لفظ تعمیری ہے۔ فیس بک پر اُن کے اقوال اور مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین کا مطالعہ کرنے والے جان چکے ہوں گے کہ وہ قومی درد اپنی ذات میں محسوس کرتے ہیں۔ ''سفنے'' دیکھنا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ ''سفنے'' وہ نہیں ہوتے جو ہمیں گہری نیند میں دکھائی دیتے ہیں۔ سفنے تو وہ ہوتے ہیں جو ہمیں سونے نہ دیں اور علم و جستجو کے ہل بوتے پر اپنی تکمیل کی راہیں تلاش کریں۔ ''سفنے'' میں شامل نظمیں ''سچی گل۔ باہر دی کمائی۔ ربا مینوں یار ملا دے۔ عشق وچھوڑا سہہ نہیں ہوندا۔ تانگھ۔ جنگ۔ اینتھے وی کوئی۔ جھوٹے فنکار۔ دو پل۔ روشنی۔ کون اٹھے گا۔ گلاں سچیاں۔ کنا اوکھا اے۔ پتے دی گل۔ توں تے نہیں سیں۔ میرا سبھ کجھ۔ کرکس۔ اکلاپا۔ خشبو۔ تھوڑ۔ سیاپا۔ دھرتی ماں۔ ساڑ۔ کمائی۔ رب سجل اے۔ حالاں نہیں۔ ویروا۔ دوجی گولی۔ کالے تے روشن۔ چارہ کریئے۔ شہید دی ماں۔ ماں۔ حقی گل۔ خوف۔ امیگریشن۔ محصہ۔ دو دو ہتھ۔ آپنا آپنا کم۔ ہورے۔ باہر دی کمائی۔ ربھاں۔ ہجر۔ کرپشن۔ بچے۔ رب سوچدا ہوئے دا۔ ایہہ کون نیں۔ دھرتی۔ آپنے حصے دا کم۔ مزآ۔ نبی دا فرمان۔ نازک ویلے اور آؤ سارے ایکا کریئے''، عنوانات سے ہی نظمیں اپنا دامن کھولے محسوس ہوتی ہیں۔ اُنھوں نے فکر و دانش کا اظہار کرتے ہوئے اپنی شاعرانہ منطق کو اپنی حدوں سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اُن کی شعری شناخت محبتوں اور رفاقتوں سے مزین ہے جو پاک دھرتی سے وابستہ ہے۔ اس دھرتی کا ذرّہ ذرّہ موسموں کی خوشبوئیں، دھنک رنگ اور لہلہاتے کھیت ایسے موضوعات کو نسلِ نو تک پہنچانے کا فریضہ قرض سمجھ کر ادا کر رہے ہیں۔ ''سفنے'' کی پذیرائی میں معروف شاعر زاہد حسن رقم طراز ہیں:

''یوسف عالمگیرین ہوراں دے ایہہ سفنے بہوں انملے نیں۔ ایہہ سفنے ''کالے تے روشن دماغاں دی جنگ'' وچوں نکلی روشن دماغاں دی جیت دے سفنے نیں۔ جو ایس دھرتی نوں لٹن کھٹن والیاں، کرپشن، جھوٹھ، مکاری تے فریب دی کھیڈ کھیڈن

والیاں دی ہار دی تعبیر بن کے جگن گے۔
یوسف دیاں نظماں وچوں وطن دی
حُب ، محبت تے ایہدی بقا دی مہک
آوندی اے۔"

یوسف عالمگیرین کے ہاں مزاحمتی رویہ اپنی آورشوں کی دنیا میں بڑا اہم درجہ رکھتا ہے۔ وہ اس مزاحمتی رویے کا اظہار اپنی شاعری میں جابجا کرتے ہیں۔ وہ کہیں فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم کا نوحہ پڑھتے ہیں تو کہیں کشمیریوں پر بھارتی مظالم کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتے ہیں۔ کہیں وہ ضربِ عضب کو ضربِ قلم سے پیش کرتے ہیں تو کہیں ردالفساد کے واقعات بھی اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔ 16 دسمبر 2014 کو آرمی پبلک سکول پشاور کے لہو لہان چہرے اُن کے لفظوں میں نظر آتے ہیں۔ دھرتی ماں سے پیار کا اظہار اُن کے ہاں فطری محسوس ہوتے ہیں۔ ممتاز شاعر، ادیب، مجاہدِ ختم نبوت اور دانش ور حضرت جبار مرزا اُن کی کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

" دانشور ، شاعر ، معاشرے دی اکھ ہندے این او نہ صرف انسانی کمزوریاں دی نشاندہی کردے این بلکہ انہاں تے قابو پاون دا ول وی دسدے این۔ اس مجموعے وچ کئی مسکلیاں داحل وی پڑھن نوں ملدا اے، ایس وچ لکھیا اے جسے برائی نوں ختم کرنا چاہوندے او تے اپنی آون والی نسلاں نوں حلال دانو الا کھواؤ، غلط طریقیاں نال کیتی گئی کمائی دے پیسیاں نال خریدے گئے مصنوعی دودھ تے فیڈر نسلاں نوں ذہنی معذور بنا دیندین فیر برائی مکان دے کنے ای ادارے بنا لو کرپشن نہیں جے مک سکدی۔"

شاعر معاشرے کی آنکھ ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ معاشرے میں دیکھتا ہے اس کی عکاسی اپنی شاعری میں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے بعض واقعات تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں یوں شاعری واقعات کا پیرہن اُڑھ کر امر ہو جاتی ہے۔ یوسف عالمگیرین نے بھی سچائی کا سائبان بنا رکھا ہے اور وہ لفظوں کو اس کی چھاؤں میں بٹھا کر مقصدیت کے سفر پر گامزن کرنے کے خواہاں ہیں۔ یوسف عالمگیرین نے بھی حق اور سچ کا ساتھ دیا ہے۔ وہ ہر ناانصافی کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ یہی ایک سچے اور کھرے شاعر کی نشانی ہوتی ہے کہ وہ ظلم دیکھ کر خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ سکتا۔ ان کی نظموں میں جہاں متنوع موضوعات ملتے ہیں۔ اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی اکثر مزاحمتی رویہ ملتا ہے۔ ایک غزل کے دو تین شعر ملاحظہ ہوں:

ملک نوں لٹ کے کھاون والے کٹھے ہو گئے نیں
لٹ لٹ باہر لے جاون والے کٹھے ہو گئے نیں

ایہناں نوں ایس دھرتی دا دکھ اے نہ کوئی پیڑ
جھوٹھے نیر دہاون والے کٹھے ہو گئے نیں

ہورے بندہ سانوں وی کوئی چنگا لبھے
ایدھر اودھر جاون والے کٹھے ہو گئے نیں

.....

یوسف عالمگیرین غزل میں جب مزاحمتی رویہ لے کر آتے ہیں تو ایک ایسی کسک اور سوالیہ نشان بھی چھوڑ جاتے ہیں جس پر قاری تادیر سوچتا رہتا ہے۔ دراصل وہ ہر اس بگاڑ کے خلاف ہیں جو ہمارے دیس اور ہماری ماں دھرتی کے خلاف ہو۔ وہ اس مٹی سے منہ موڑنے والوں سے بھی نالاں ہیں۔ پھر دوسرے لمحے میں اس کا سبب بھی ڈھونڈنے لگتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ لوگ ماں جیسی دھرتی کو چھوڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

شامو شامی بوہے کھڑکن لگ پئے نیں
اندر واندریں دل دی دھڑکن لگ پئے نیں

ہسدے ہسدے دیس نوں ہورے کیہ ہویا اے
لوکی چھڈ کے ماں جیہی مٹی نسن لگ پئے نیں

.....

یوسف عالمگیرین کی غزل میں ہجر و وصال کے تمام ذائقے موجود ہیں وہ غزل کو غزل بنانے میں کمال ہنرمندی سے کام لیتے ہیں وہ غزل کی کسک کو پوری شدت کے ساتھ شعروں میں لے کر آتے ہیں۔ ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہن تے کلیاں رہن دی عادت ہو گئی اے
مینوں ویکھ کے کِکر سکن لگ پئے نیں
دل نوں پیار دے پینڈے پا کے مکھ کسے دی پایا نہیں
اڈیاں چک چک پئی میں ویکھاں ماہی گھر نوں آیا نہیں

ساہواں وچوں خشبو آوے اوہدیاں گوڑھیاں یاداں دی
ٹٹ پینے ایس جسے نوں کجھ تھوڑا میں تڑپایا نہیں

.....

عشق وچھوڑا سہہ نہیں ہوندا
اوہدے باجھوں رہ نہیں ہوندا
دل دا ساڑا کسراں کڈھاں
عشق فسانہ کہہ نہیں ہوندا

.....

یوسف عالمگیرین نظم اور غزل دونوں اصناف ادب میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ ہر طرح کے موضوعات شاعری سانچے میں ڈھال لیتے ہیں جس سے ان کی شاعری رنگا رنگ گلدستے کی سی ہو گئی ہے، جس میں ہر پھول اپنی ایک الگ ہی خوشبو دے رہا ہے۔ ماں ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ دیگر شاعروں کی طرح انھوں نے بھی ماں کو نظم اور غزل میں محبت کا تاج محل تصور کر رکھا ہے۔ اسی ماں کو انھوں نے دھرتی ماں سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اُن کی شاعری میں انسانی رشتے اعتماد اور حوصلے کا ہاتھ تھامے قدم بہ قدم چل رہے ہیں۔

تجربہ میرا اُستاد اور ٹھوکریں میری تعلیم کے مصداق یوسف عالمگیرین ٹوٹتے سپنوں اور چشم اشک بار سے گمنام منزلوں کی تلاش میں ہیں۔

آپنے پنڈ نوں جاواں کیکن
ٹر جاواں تے آواں کیکن
ماں باجھوں ہن کجھ نہیں لبھدا
کٹھیاں کراں دعاواں کیکن

.....

یوسف عالمگیرین کی نظموں میں وطن عزیز سے محبت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ دوسروں کو بھی وطن سے گہری محبت اور عقیدت رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ دوسرے لوگوں کو باور کراتے ہیں کہ اس دیس جیسا دنیا میں کوئی پیارا دیس نہیں ہے۔ اس لیے آپس میں پیار و محبت کے ساتھ رہو اور اپنے پیارے وطن سے محبت رکھو۔ وہ اپنی نظم ''دھرتی'' میں کہتے ہیں:

جان توں ودھ کے پیارے لوکو
میرے دیس دے سارے لوکو
دھرتی آپنی مل سنوارو
اٹھو دیس دے شہ سوارو
ملک توں اتے کوئی شے نہیں جے
ایہدے ورگا کوئی ہے نہیں جے
آپنے حصے دی شمع جلاؤ
غیرنوں اپنے ہتھیں مکاؤ
تسیں جے ایکا کرلو گے
رب دی سونہہ تر جاو گے

اس حقیقت سے انکار مفر نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر خوابیدہ قوم کو جگانے کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے قبیلے سے تعلق رکھنے والے رجائیت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ یوسف عالمگیرین کا تعلق بھی شاعری کے اسی دبستان سے ہے جن کا مقصد قنوطیت کے بجائے اُمید اور نوید کامرانی ہے۔ اسی طرح ان کی ایک اور نظم ''خوف'' میں بھی ماں دھرتی سے بے حد محبت کے جذبات ملتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

دہشت گردی توں
ڈردے
لوکی
آپنی جوہ وی
چھڈ جاندے نیں۔
تے
دور کتے
ٹر جاندے نیں
تے پچھے
چھڈ جاندے نیں
روندی دھرتی
تے روندے ماپے

یوسف عالمگیرین کی شعری آواز آنے والے دنوں کے مدھر خوابوں میں سچائی کی کوک ہے۔ اُن کی زندگی کامرانیوں اور کامیابیوں کی ابرش ہے۔ میری دُعا ہے کہ اُن کے سفنے حقیقت کے منظر نامے کا حصہ بن جائیں۔

☆☆☆☆☆

ماں! لوٹ آؤ

ماں! ہم کتنی بے خبر اولاد ہیں کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ تمھاری زندگی میں بڑھاپا در آیا ہے اور ایسا بڑھاپا جب ایک لمحہ ایسا بھی ہوگا کہ تم اپنا بوجھ بھی نہ سہار پاؤ گی۔ ہم ہمیشہ یہ سوچتے رہے کہ تمھیں کب ہمارے سہارے کی ضرورت پیش آئے گی۔ شاید ایسے ہی جیسے دہائیوں پہلے ہمیں اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے کے لئے سہارے کی ضرورت تھی تو تم سارے جہان کی محبت آنکھوں میں سموئے دونوں ہاتھ بڑھا کر سہارا دیا کرتی تھیں۔ ویسے بھی تو تم لاٹھی چھڑی پسند نہیں کرتی تھیں۔ کئی بار میرا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک دیا کہ میں خود چل سکتی ہوں کیوں میرا ہاتھ پکڑ رہے ہو۔ مجھے تمھارے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماں! اِن سب بڑی عمر کے لوگوں کو کیسی خوش فہمی لاحق ہوتی ہے! اِن لوگوں کو بغیر سہارے کے رہنا کیوں اچھا لگتا ہے! یہ کیوں سہاروں کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں! یہ سب کیوں نہیں سمجھتے کہ وقت بے وفا ہے اور بدل سکتا ہے، عمر دھوکا ہے اور ڈھل سکتی ہے، جسم بھی شاید بھرم ہے جو کسی وقت بھی فریب دے سکتا ہے۔ ماں! کتنی عجیب بات ہے کہ انسان صرف اپنے ہی بوجھ سے گر بھی سکتا ہے۔ ماں! یہ کون سوچ سکتا تھا کہ تم جو زندگی بھر ہمارے حصے کے سارے دُکھوں اور تکلیفوں کا بوجھ اُٹھا لیا کرتی تھیں اپنا بوجھ نہ اُٹھا سکو گی۔ ماں! تم گر گئیں اور تم کیا گریں کہ محبت و وفا کے سارے پیمانے بھی لمحوں میں گر گئے۔ میں بھی زندگی میں پہلی بار زمیں بوس ہو گیا۔

ہفتے کی صبح عائشہ نے مجھے بوکھلائی ہوئی آواز میں آ کر بتایا کہ امی گر گئی ہیں تو میں بجلی کی رفتار سے تمھارے پاس پہنچا لیکن تمھارے پاس پہنچنے سے پہلے میری کوششیں بے سود ہو چکی تھیں۔ میں جو ہمیشہ وقت اور مقام کے بکھیڑے میں اُلجھا رہتا ہوں یہ جان چکا تھا

طلعت شبیر

کہ ہم اچانک وقت اور مقام کے بائیں طرف آ چکے ہیں اور سب کچھ ہمارے لئے موافق نہیں رہا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں بھی تمھارے ساتھ فرش پر بیٹھ گیا کہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فوری طور پر میں کیا کروں۔ تھوڑی دیر بعد جب میں نے کہا ماں اپنا بوجھ مجھ پہ ڈال تو تا کہ میں تمھیں اُٹھا سکوں تو تم اُس تکلیف کے لمحے میں بھی اپنا بوجھ مجھ پر ڈالنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ ماں! اُس دن سے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ دُکھ اور تکلیف بھی تو صرف اپنی اپنی ہوتی ہے کہ لاکھ چاہنے کے باوجود میں کسی طور بھی تمھاری تکلیف خود پر نہ لے سکا اور بے بسی سے تمھارا پُر نور چہرہ پیلا پڑتا دیکھتا رہا۔

ماں! تم جب بھی اسلام آباد میں رہتی ہو تو اپنی پوتی عائشہ کے کمرے میں رہنا پسند کرتی ہو۔ تم نے ہمیشہ عائشہ کا کمرا اس لئے چنا کہ اُس کمرے کی کھڑکی خوبصورت اسلام آباد کی جانب کھلتی ہے۔ اُس کھڑکی سے دُور دُور تک پھیلی ہوئی مارگلہ کی پہاڑیاں اور سرسبز و شاداب درختوں کی بہار دکھائی دیتی ہے۔ صبح کی روشنی کے ساتھ پرندوں کی چہچہاہٹ بھی سُنائی دیتی ہے۔ ماں! کسے خبر تھی کہ جس کمرے میں تم روز اُٹھتی بیٹھتی ہو چلتی پھرتی ہو وہاں یہ تکلیف ایک دن تمھارا انتظار کر رہی ہوگی۔

ماں! میں نے فوری طور پر عظمت اور سعدیہ کو راولپنڈی سے بلوا لیا کہ تمھارے خیال میں عظمت بہت خیال رکھنے والا بیٹا ہے۔ عظمت کے آنے پر ہم تمھیں اسلام آباد میں ایک قریبی ہسپتال میں لے کر گئے تا کہ ایکسرے کروایا جا سکے۔ ایکسرے سے پتا چلا کہ ٹخنہ فریکچر ہو گیا ہے۔ فریکچر کی خبر ہم پر قیامت کی طرح گذر گئی۔ ہم بھاگے بھاگے راولپنڈی سی ایم ایچ پہنچے۔ ڈاکٹرز نے فوری طور پر ٹخنہ اپنی جگہ پر جوڑ دیا لیکن ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ آپریشن کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ ماں! پھر پورے چوبیس گھنٹے ہم نے تمھیں آپریشن کے لئے ذہنی طور پر تیار کیا۔ 'چھوٹا سا تو آپریشن ہے، کچھ نہیں ہوتا، بے ہوش تو بہت سر لیں آپریشن کے لئے کرتے ہیں اور یہ معمولی سا آپریشن ہے صرف پاؤں سُن کریں گے' وغیرہ وغیرہ۔ ہم تمھیں تسلیاں دے رہے تھے اور تم ہماری تسلیاں دلاسے سُن کر مسکرا رہی تھیں۔ آپریشن والے دن تم ہم سے تین گھنٹے کے لئے بچھڑ گئیں۔ ایسا بہت کم ہوا کہ ہم نے تمھیں اتنی دیر تک کے لئے اکیلا چھوڑ دیا ہو۔ ڈاکٹرز بھی اچھے تھے کہ اُنھوں نے طفل تسلیاں دے کر آپریشن کر دیا اور آپریشن کے بعد چالیس منٹ کے لئے آپریشن کے طریقہ کار کے مطابق ریکوری کے کمرے میں بھجوا دیا۔ ریکوری میں گذرا وقت تمھارے لئے سخت کوفت اور پریشانی کا باعث ہوا۔ جب آپریشن تھیٹر سے باہر آئیں تو پہلے عظمت کو ڈانٹا کہ تم لوگ مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔ اور جب مجھ پر نظر

پڑی تو مجھے بھی ڈانٹا کہ تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ماں! سب ٹھیک ہو گیا ہے اور ڈاکٹرز کے مطابق آپریشن بھی کامیاب ہو گیا ہے۔ تھوڑی ریلیکس ہوئی تو کہنے لگی۔ 'میں نے ڈاکٹرز سے پوچھا کہ میرے بیٹے کہاں ہیں تو اُنھوں نے کہا کہ ہم بھی تو آپ کے بیٹے ہیں'۔ میں نے کہا۔ 'ماں! ہر جگہ بیٹے تو نہ تو ساتھ ہو سکتے اور نہ ہی سب کچھ اُن کے بس میں ہوتا ہے'۔ مگر تم کہاں ماننے والی تھیں!

ماں! آپریشن کا دوسرا دن بھی بہت مشکل اور صبر آزما دن تھا۔ میں اور ناہید تمھاری خدمت کے لئے موجود تھے۔ صبح سے تمھیں عجیب بے چینی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا میں بار بار تمھیں گلے لگا کر تسلی دے رہا تھا۔ اچانک شوگر لیول بہت بڑھ گیا اور آکسیجن لیول ساٹھ کے درجے تک گر گیا۔ ای سی جی کی گئی تو ایسی تبدیلیاں آ گئیں کہ بات میڈیکل ایمرجنسی تک پہنچ گئی۔ فوری طور پر آکسیجن کے سلنڈرز اور طبی نگرانی کرنے والے دوسرے آلات کمرے میں پہنچ گئے۔ ماں! تم نے آنکھیں موند لیں اور مجھے بھی اپنی دُنیا اندھیر نظر آنے لگی۔ کمرے میں لگے آلات کچھ اچھا نہیں دکھا رہے تھے۔ اور ہر بار تکلیف کی وجہ سے آہ بھرنے پر میں تمھیں گلے لگا لیتا۔ ماں! زندگی میں ہمیشہ میری تکلیف پر تم 'ماں صدقے' کہا کرتی تھیں لیکن تمھاری تکلیف پر مجھ سے ماں صدقے کا جواب الجواب نہیں بن پا رہا تھا۔ اور شاید لفظوں کی دُنیا کے لوگ بھی اِس سے خوبصورت اور بامعنی الفاظ نہ سوچ پائے جو تکلیف میں مبتلا ماں کو مخاطب کر کے کہے جا سکیں۔ گھنٹوں کی کشمکش کے بعد حالات معمول کی طرف جانا شروع ہوئے۔ ماں! جب تمھیں ہوش آیا اور تم نے آنکھیں کھولیں تو ہمیں یوں لگا جیسے ہماری سانسیں بھی بحال ہونا شروع ہو گئیں۔

ماں! ہماری آزمائش کے اور تمھارے امتحان کے سات دن گذر چکے ہیں۔ تم ابھی تک ہسپتال میں ہو۔ ہم سارا دن تمھارے پاس گذارتے ہیں اور رات کو تمھیں ناہید اور سعدیہ کے حوالے کر کے بوجھل قدموں سے گھروں کو لوٹ آتے ہیں۔ ہمارے گھر تمھارے بغیر سُونے سُونے لگتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ عائشہ کی کھڑکی کے باہر پرندے اب بھی چہچہاتے ہیں یا خاموش ہیں۔ میں نے عائشہ کی کھڑکی سے جھانک کر سرسبز و شاداب درختوں پر آئی بہار بھی نہیں دیکھی کہ تمھارے بغیر بہاریں کیا اور بہاروں کے رنگ کیا!۔ مجھے عائشہ کی کھڑکی سے خوبصورت اسلام آباد اور مارگلہ کی خوبصورت پہاڑیاں بھی نظر نہیں آتیں۔ ماں! ہم سب اُس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب تم اپنے پاؤں پر چل کر اپنے گھروں کو لوٹ کر آؤ گی کہ پرندوں کی چہچہاہٹ میں زندگی اور ہماری بہاروں میں رنگ تمھارے دم سے ہے۔

☆☆☆☆☆

خالد احمد کی روشن یادیں

کوئی عمدہ تخلیق کار اچھا انسان بھی ہو تو یہ دو آتشہ ہے یہ وہ خصوصیات ہیں جو لوگوں میں کم کم ہی دکھائی دیتی ہیں لوگ اپنی ضروریات اور تقاضوں کی بنیاد پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور اس عارضی اور مختصر سی زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے کے لیے وہ ہر طرح کے طریقہ ہائے واردات کا سہارا لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اخلاص اور محبت نام کی چیز ناپید ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن اسی معاشرے میں خالد احمد کی شکل میں ایک ایسی شخصیت بھی موجود رہی جو شخصی خوبیوں کا سرچشمہ تھی----

خالد احمد انسانی خوبصورتیوں کا پیکر، سراپا جمال، شاعرِ بے بدل، بااصول، صاف گو، منافقت سے کوسوں دور، تخلیقیت کی عمدہ مثال----

اُن کی شخصیت عجز و انکسار کا عمدہ نمونہ تھی بڑوں کو احترام دینا اور چھوٹوں سے مشفقانہ برتاؤ سے پیش آنا اُن کی فطرت کا حصہ تھا میرا اُن کی نشستوں میں بہت زیادہ اُٹھنا بیٹھنا نہیں رہا لیکن جتنی بھی ملاقاتیں ابن سے ہوئیں اُن سے جڑی ہوئی خوشگوار یادیں اتنے برس گزر جانے کے باوجود آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔

اُنھوں نے نئے آنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی فرمائی اور اُن کی فنی صلاحیتوں کے اعتراف میں کبھی بخل سے کام نہ لیا۔ اُنھوں نے نوجوان لکھنے والوں کی سرپرستی کرتے ہوئے اُن کی تخلیقی تربیت کی ذمے داری کو بھی نہایت خوش اُسلوبی سے نبھایا اور اُنھیں آگے بڑھنے کے مواقع بھی فراہم کیے۔

علی رضا

مجھے اچھی طرح یاد ہے یہ غالباً اسی کی دہائی کے وسط اور میرے مشقِ سخن کے ابتدائی برسوں کی بات ہے ایک دفعہ میرا پاک ٹی ہاؤس لاہور جانا ہوا وہاں خالد احمد (مرحوم) دیگر احباب کے ساتھ تشریف فرما تھے جب کسی دوست نے میرا اُن سے شعری حوالے سے تعارف کروایا تو بڑی خوش دلی سے پیش آتے ہوئے مجھے فرمانے لگے کوئی غزل سنائیں میں نے اُن کے حکم کی تعمیل میں جب اپنی غزل کے چند اشعار سنائے تو بڑے انہماک سے سُننے کے بعد وہاں موجود دوستوں کی موجودگی میں میری غزل کی تعریف کرنے لگے۔ ہم نے اپنے تخلیقِ شعر کے اوائل سے اُن کی وفات تک حسبِ توفیق ان سے بہت کچھ سیکھا۔ اُنہوں نے تمام اصناف شعر و ادب میں نہایت دلفریب اور دلکش انداز میں اپنے تخلیقی سفر کو جاری و ساری رکھا۔

خالد احمد ایک درویش منش اور اپنی دُھن میں مگن رہنے والے ایک لاجواب انسان اور بے مثال تخلیق کار تھے جنہوں نے تمام عمر قابلِ قدر اور غیر معمولی تخلیقی عمل کو آگے بڑھایا۔

خالد احمد شعری تخلیقی اُفق پر ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے اُنھوں نے جتنا بلند پایا تخلیقی کام کیا ہے اُس کے شایانِ شان ابھی اُن کی فنی پرتیں کھل کر قارئینِ شعر و ادب کے سامنے نہیں آئیں لیکن وہ وقت دور نہیں جب اُن کے فکری اور فنی پہلوؤں کی روشنی میں بہت سا تحقیقی اور تنقیدی کام منظرِ عام پر آئے گا اور سخن وادی کی تنگی اور تاریکی وسعتوں اور روشنیوں میں بدل جائے گی۔

وہ ساہیوال کے بزرگ شعراء بالخصوص جناب گوہر ہوشیار پوری اور جناب حاجی بشیر احمد بشیر کے بے حد گرویدہ اور اُن کی شاعری کے مداح تھے۔ اُن سے جب بھی کبھی ملاقات ہوتی وہ ان اساتذہ کی خیر و عافیت مجھ سے ضرور پوچھتے۔

ریڈیو، ٹی وی سمیت اعلیٰ سطح پر منعقد ہونے والے مشاعروں کا انعقاد اُن کے بغیر ادھورا ہوتا۔

خالد احمد (مرحوم) کے حُسنِ ظرافت کا انداز بھی خُوب تھا اُن کی وفات سے دو تین برس قبل کا واقعہ ہے میں اور عزیز دوست حسن عباسی انہیں کسی ادبی تقریب کا دعوت نامہ دینے ادبی بیٹھک الحمرا لاہور پہنچے وہاں خالد احمد اپنے دیگر دوستوں کے ہمراہ تشریف فرما تھے۔ ہمارا حال احوال دریافت کرنے کے بعد حسن عباسی سے پوچھنے لگے سنائیں آپ کے عطاالحق قاسمی

کا کیا حال ہے اور یہ بھی بتائیں کہ وہ موٹے ہیں کہ سمارٹ ؟ حسن عباسی نے تھوڑے سے توقف کے بعد جواب دیا سمارٹ ہیں۔ خالد احمد دوبارہ گویا ہوئے تو میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے حسن نے جواب دیا آپ سمارٹ نہیں ہیں۔ حسن کا بے ساختہ جواب سن کر محفل دیر تک کشتِ زعفران بنی رہی خود خالد احمد کی ہنسی بھی کافی دیر اُن کے بس میں نہ رہی۔ دراصل اُن کے پیشِ نظر کسی کی تضحیک کا پہلو نہیں ہوتا تھا بس تفننِ طبع کے لئے کوئی نہ کوئی ایسا چٹکلا چھوڑ دیتے جس سے ماحول خوشگوار ہو جاتا۔

وہ جتنے بلند پایہ تخلیق کار تھے اُس سے کہیں بڑے انسان تھے۔ فقیرانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ زندگی گزار گئے۔

میں نے خالد احمد کی نمازِ جنازہ میں بھی شرکت کی تھی میدانِ شعر و ادب سمیت زندگی کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی کثیر تعداد اِس موقع پر موجود تھی۔ میں جس قطار میں تھا میرے دائیں اور بائیں خالد احمد کے یارِ دل قریں معروف شاعر نجیب احمد اور نامور سفر نامہ نگار، سینئر بیوروکریٹ سید شوکت علی شاہ کھڑے تھے۔ نجیب احمد اور خالد احمد کی دوستی یک جان دو قالب کی مصداق تھی یہی وجہ تھی وہ خالد احمد کی جدائی کے غم میں بُری طرح نڈھال تھے اور بار بار خود کلامی کے انداز میں کچھ نہ کچھ کہے جا رہے تھے۔ نمازِ جنازہ کے بعد بھی اُن کا یہ عمل جاری رہا ایک موقع پر میں اُن کے قریب جا کر یہ سننے لگا کہ وہ کیا خود کلامی کئے جا رہے ہیں تو میں نے سُنا وہ یہ کہے جا رہے تھے"-- یا اللہ یا اللہ یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا۔ یا اللہ تیرے حکم پہ زندگی کی شاخ سے یہ کیسا دلفریب پھول ٹوٹ گرا ہے"

خالد احمد نے مدتوں پہلے "ماہنامہ بیاض" کے نام سے جس معیاری ادبی رسالے کا بیج بویا تھا وہ اب تناور شجر کی صورت اختیار کر چکا ہے اور تواتر سے اپنی کامیاب اشاعت کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

خالد احمد شعری تخلیق کا ایک ایسا روشن اور خوبصورت حوالہ جس کی دلکشی ہمیشہ برقرار رہے گی۔ دلوں کو اپنے اخلاص اور مروت سے مسخر کرنے والے خالد احمد نے اپنے پیچھے وہ بے بہا تخلیقی ورثہ چھوڑا ہے جو اُن کی شناخت کا چراغ کبھی گل نہیں ہونے دے گا۔ ان شاء اللہ

آیئے اُن کی شعری کائنات کے دل نشین ماحول میں داخل ہو کر قلب و جاں کو خوشگوار اور پُر کیف بناتے ہیں---

ابن کا بارگاہِ خیر الانام میں اظہارِ عقیدت کا

انداز ملاحظہ فرمائیں---

تو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیت لکھی
خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

.....

غزل کی تخلیق میں بھی منفرد اور اچھوتا انداز خالد احمد کی منفرد تخلیقی پہچان کا حوالہ ہے۔ درج ذیل اشعار دیکھیں۔

ترکِ تعلقات پہ رویا نہ تو نہ میں
لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تو نہ میں

کوئی تو روئے لپٹ کر جوان لاشوں سے
اسی لیے تو وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے

.....

آخر میں اُن کی سہلِ ممتنع میں کہی گئی ایک خوبصورت غزل نذرِ قارئین ہے-----

کھلا مجھ پہ در امکان رکھنا
مرے مولا! مجھے حیران رکھنا

یہی اک مرحلہ منزل نہ ٹھہرے
یہی اک مرحلہ آسان رکھنا

مرے دل کا ورق نکلے نہ سادہ
کوئی خواہش کوئی ارمان رکھنا

یہ دل طاقِ چراغِ زر نہ ٹھہرے
مرے مالک مجھے نادان رکھنا

مرے حالات مجھ کو چھو نہ پائیں
مجھے ہر حال میں انسان رکھنا

بھری رکھنا مرے مولا! یہ آنکھیں
دکھوں کی بارشوں کا مان رکھنا

مرے ساتھی بھی مجھ سے بے نوا ہیں
بساطیں دیکھ کر نادان رکھنا

یہ دن کیونکر چڑھا وہ شب ڈھلی کیوں
مجھے آیا نہ اتنا دھیان رکھنا

ہوا کی طرح صحرا سے گزر جا
سفر میں کیا سر و سامان رکھنا

مجھے بھی عام یا گمنام کر دے
کہ اک آزار ہے پہچان رکھنا

اسیرِ عمر کو آیا نہ اب تک
کتابِ ہجر کا عنوان رکھنا

☆☆☆☆☆☆

شاہدہ عروج خان ''محبت آزماتی ہے'' کے تناظر میں

رانا خالد محمود قیصر

اُردو شاعری میں مردوں کیساتھ خواتین بھی سخن آرائی میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ یہ شاعری کا سفر کوئی ایک دو پل کی کہانی نہیں ہے، یہ سفر صدیوں کا ہے۔ ابتدا میں خواتین شاعرات کا نام خال خال ہی ملتا تھا، وہ بھی بغیر کسی سند کے مگر جوں جوں علم و آگہی کا سفر آگے بڑھا خواتین کا فکر و شعور سامنے آتا چلا گیا تو معلوم ہوا کہ خواتین بھی علم و فن میں اپنی حیثیت منوا رہی ہیں۔ اُردو شاعری کے ابتدائی عہد میں برصغیر میں ماہ لقا چندا بائی اور لطف النسا بیگم کا نام ملتا ہے جبکہ قیام پاکستان کے بعد ادا جعفری کا نام نمایاں ہے (ادا جعفری کی تربیت میں اختر شیرانی اور اثر لکھنوی کا حصہ ہے)

ماہ لقا چندا بائی کو اُردو شاعری میں پہلی دریافت قرار دیا گیا ہے دیگر شاعرات میں شوخ، عابدہ، سردار بیگم وغیرہ شامل ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں خواتین شاعرات کے روایتی اور غیر روایتی رنگ اپنے اپنے انداز سے ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں سماجی رویئے، رشتوں کی ناہمواری، احساس تنہائی، پیا ملن کی آس جیسے موضوعات کیساتھ ساتھ مستقبل کی اُمید، گل اور آنگن کے پھول کا تذکرہ، عروس اور شہنائی، حزن و ملال جیسے موضوعات اہمیت رکھتے ہیں۔

ہمارے عہد کی شاعرات نے ایک نئے دور کا خواب دیکھا ہے۔ نئی اُمنگ اور نئے حوصلے کی بات کرتی ہیں۔ وہ ایسے ماحول کی متلاشی ہیں جس میں فریب اور دھوکہ دہی نہ ہو، جہاں اُسے کوئی اپنی ملکیت تصور نہ کرے بلکہ اُسے پھولوں کی رانی بنا کر رکھے مگر دیکھے نندنی سا نیو یہ اُڑیسہ کی شاعرہ تھیں اور معتبر نقاد تھیں۔ ترکی کی ثریا تمکین، ایران کی شیما کلپاسی (یہ حقوق نسواں وحقوق انسانی کی علمبردار تھیں، ان کی پرورش پاکستان اور ڈنمارک میں ہوئی۔ پاکستان کے شہر کراچی سے اُبھرنے والی دو شعری مجموعوں کی خالق شاہدہ عروج خان آج ہم سب کے سامنے شاعرہ، افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے موجود ہیں اور ادبی منظرنامے میں تیزی سے اپنی جگہ بنا رہی ہیں اور اپنی تخلیقات سے اپنی شناخت اور حیثیت کو منوا رہی ہیں۔

عصر رواں میں جن شاعرات کا نام نامی ادبی منزلوں پر ادا جعفری، پروین شاکر، کشور ناہید، فاطمہ حسن، زہرہ نگاہ، سارہ شگفتہ، نوشی گیلانی، عذرا عباس، فہمیدہ ریاض، فاخرہ بتول، ذکیہ غزل ودیگر کے نام ادبی اُفق پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ عصر رواں میں ریحانہ روحی، حجاب عباسی، نزہت عباسی، نسیم نازش، صائمہ اسحاق، بشریٰ سعید، سیما غزل، ارم بٹ، سیما عباسی، حمیرا راحت، یاسمین یاس، سحر علی اور صاحب کتاب شاہدہ عروج خان اپنی اپنی کامیاب شعری کاوشوں کے طفیل ادب کی خدمت کر رہی ہیں اور قلم وفن کے ذریعے اپنی حیثیت وشناخت کو مستحکم کر رہی ہیں۔

شاہدہ عروج خان کا تعلق حیدرآباد سے ہے، وادیٔ مہران کے شہر حیدرآباد کا یہ خاصہ ہے کہ گرمیوں کے دنوں میں بھی شام کی ٹھنڈی ہوا اور رات کی مسحور کن فضا شعروسخن کے لیے موزوں ہے۔ دریا کا کنارا، ہوا کی سرگوشی بہت کچھ کہہ جاتی ہے۔ اس کا اثر شاہدہ عروج کی شاعری میں نظر آتا ہے جس کا اظہار ''محبت آزماتی ہے'' میں نظر آرہا ہے۔ بہت عجیب ہیں یہ سب محبتوں کے سلسلے وہ آکے دل میں بس گیا یہ حسن اتفاق ہے

.....

یہ دل میں بسنا، محبتوں کے سلسلے اور پھر حسن اتفاق یہ سب جذبات واحساسات کے دریچے ہیں جہاں تخلیق کار اپنے زمانے کے رویوں کی عکاسی یوں بھی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

کچھ سمندر سے بھی گہری مری تنہائی ہے
تجھ سے بچھڑی تو مری جان پہ بن آئی ہے
اک تری یاد کا جلتا ہے دیا پھر سرِ شام
اور میں ہوں، مرا دل ہے، مری تنہائی ہے

.....

شاہدہ عروج کی شاعری میں روزمرہ کے پیش آنے والے واقعات احسن انداز میں ملتے ہیں۔ وہ اپنی ذات سے کسی کو نقصان پہنچانے کا سوچتی بھی نہیں ہیں۔ نہ ہی نوحہ کناں ہوتی ہیں بس اپنے جذبات کا اظہار سادہ اور سہل پیرائے میں کر جاتی ہیں کہ

سننے اور پڑھنے والوں پہ یہ گراں نہیں گزرتا۔

کیا کہیں کیسی بے قراری ہے
ہجر کی دل پہ رات بھاری ہے
لکھتی ہوں ہمیشہ محبت کے ترانے
نفرت کا قصیدہ مجھے لکھنا نہیں آیا

.....

سادہ اور آسان لہجہ میں روایتی تراکیب کی پرواہ کئے بغیر اپنی شگفتہ بیانی سے اپنے خیالات کے ذریعے دھوکہ باز زمانے کی بدنما چالوں کو بے نقاب کرنے میں کمال رکھتی ہیں۔

آہ یوں دل سے نکلتی ہے کبھی جیسے کوئی
رات کے پچھلے پہر توڑ کے زنداں نکلے
سائے کی طرح مرے ساتھ جو رہتے تھے کبھی
سانس کی طرح وہی مجھ سے گریزاں نکلے

.....

شاہدہ عروج کی شاعری میں حقیقت کی تلاش کا عنصر سرگرداں نظر آتا ہے۔ جسکو تلاش کرنے میں انہوں نے ایک مدت گزاری ہے۔ وہ اپنا سفر مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں، ان کی ذاتی مشاہدہ انسانی رویوں اور اقدار کے مطالعہ میں صرف ہو رہا ہے۔ یہ کوئی مبالغہ آرائی یا تصنع کی قائل نہیں ہیں بلکہ سچ کی متلاشی ہیں۔ ان کے ہاں جہاں محبوب اور محبت کا ذکر ملتا ہے وہیں محبوب کے رنگ اور عشق کی خوشبو کو انہوں نے اپنے اشعار میں ملفوف رکھا ہے۔

اگر غور سے ان کی شاعری کا مطالعہ کریں تو آپ کو مکمل مفاہیم ملیں گے کوئی ادھورا پن، ذو معنی یا ابتذال کا شائبہ تک نہیں ملے گا، یہی وجہ ہے زندگی کی تازہ کاری ان کا شعری رجحان ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

محبت محبت کی رٹ مت لگا
محبت کا کوئی طلب گار ہے کیا
آئینہ ہٹانے سے تو بہتر ہے عروج اب
جو عیب ہیں چہرے پہ انہیں آپ مٹا دیں

.....

ایک ایسا رنگ جو ہر ایک ذی شعور کی زندگی میں دبے پاؤں زندہ رہتا ہے اور لمحہ بہ لمحہ کسی کی یاد دلاتا رہتا ہے جس سے انسان ایک خلش اور ایک کسک محسوس کرتا ہے۔

آنکھ اٹھا کر بھی نہیں اب دیکھتی
مجھ سے کتنی بدگماں ہے زندگی

.....

شاہدہ عروج ایک نفیس، حلیم الطبع اور سلیقہ شعار تخلیق کار ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار میں بھی سلیقہ رکھا ہے۔ ان کی شعریت میں بے تابی ایک چاشنی کا درجہ رکھتی ہے اور ایک اعتماد اور اعتبار قائم رکھنے میں کامیاب رہی ہیں۔

یقینی طور پر شاہدہ عروج کا شعری مجموعہ محبت آزماتی ہے، ایک تازہ ہوا کا جھونکا اور ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ ہم ان کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں اور دوسرے شعری مجموعے کے بعد تیسرے کی توقع بہت جلد رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

مکالمے کی اہمیت / ضرورت

سید تحسین گیلانی

ہمارے ہاں مکالمے کو وسیع پیمانے پر آج تک نظر انداز کیا گیا ہے۔سکول کالج کی سطح پر اس کا فروغ ناپید ہی رہا یونیورسٹی لیول پر مخصوص کلاسز میں ڈائیلاگ کی موجودگی خوش گوار اور احسن عمل ہے لیکن وہ بہت محدود ہو کر رہ جاتا ہے یا تو طلبا اس روش کر باہر بھی آگے بڑھائیں تو کچھ بات بن جائے لیکن ایسا ہوتا نہیں جس کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ ادب/سماج/سیاست/غرض کہ ہر میدان زندگی میں نئی سوچ کا فقدان ہے نئے آئیڈیاز کی شدید کمی ہے۔

انگریزی ادب میں مکالمے کو خاص مقام و مرتبہ حاصل ہے وہاں تعلیمی اداروں میں بچوں کو اس کا عادی بنایا جاتا ہے یوں ان میں سوال کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا new thinking کا رجحان پروان چڑھتا ہے۔

معروف سکالر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

Samuel P. Huntington's theory of a Clash of Civilizations.

This theory argues that "the political translation of dialogue among

civilizations would consist in arguing that culture, morality, and art must prevail on politics".

یہ بات کس حد تک صائب ہے دانشوار اپنی رائے ضرور دیں۔

اردو ادب میں 1950 میں مولانا صلاح الدین نے اپنے رسالے ''ادبی دنیا'' میں ادبی مکالمے کا اہتمام کیا بعد ازاں وزیر آغا نے اس روش کو ''اوراق'' میں برقرار رکھا، پھر ''ماہ نو'' اور ''صریر'' میں بھی بہترین مکالماتی ماحول بنا رہا۔ لیکن بعد ان ہستوں کے جانے کے ساتھ ہی مکالمہ بھی رک گیا۔

گراؤنڈ لیول پر تو اس کا اہتمام پہلے ہی مفقود تھا۔ حلقے کی روایت جو آج ہے وہ پہلے جیسی ہرگز نہیں معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گا وہاں مکالمہ یا تو ستائش باہمی کا منظر پیش کرتا ہے یا تنقیص کی سطح پر آ کر رک جاتا ہے۔

ایک دوسرے کی بات سن کر ڈائیلاگ آگے نہیں بڑھ پاتا۔

مجھے خوشی ہے پچھلے کچھ سالوں سے چند دوست مکالماتی فضا کو زمینی سطح پر بحال کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

اس وقت گراؤنڈ لیول پر کچھ دوست متحرک نظر آ رہے ہیں جن میں انجم سلیمی، حماد نیازی، فیضان ہاشمی، ندیم بھابھہ، اظہر فراغ، شاہد رضا، مافات رضا، شہزاد شاکر، ساجد نعیم اور راقم نے چند کوششیں کی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے وسائل میں رہتے ہوئے نئے سرے سے مکالمے کے لیے راہ ہموار کی ہے۔

حماد نیازی کی کوششوں سے کو لاج کے زیر اہتمام سرگودھا میں کامیاب کانفرنسوں کا انعقاد، یوں ہی راقم نے میں پہلی مائکرو فکشن کانفرنس سجائی اور لاہور میں شام افسانہ کا اہتمام کیا، ندیم بھابھہ نے بہترین ادبی کانفرنس لاہور میں برپا کی اور تین نسلوں کو ایک سٹیج پر اکٹھا کیا، یوں ہی شاہد رضا نے نظم جدید پر مکالمے کی راہ کھولی۔ مافات رضا اور دوستوں نے حلقے کی نشستوں میں ڈائیلاگ کی پرورش کی اور راقم نے بھی دو ایک نجی مکالماتی نشستوں کا اہتمام کیا۔

ساؤتھ آفریقہ سے واپس آنے کے بعد فکشن پر میں نے لاہور میں شام افسانہ کا اہتمام کیا جس میں ملک بھر کے نامور افسانہ نگاروں کو اکٹھا کیا گیا اور فکشن پر مکالمے کو آگے بڑھانے کی سعی کی گئی تین افسانے پیش کیے گئے اور ان پر گفتگو کی گئی علاوہ ازیں علامتی تجریدی فکشن کی اہمیت پر۔ جمیل احمد عدیل، جاوید انور، شبہ طراز، روما رضوی، شاہد رضا، جواد حسنین بشر، ارشد محمود

ہادی، مدیر ناوا اور راقم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا یوں فکشن کے حوالے سے کئی گرہوں کو کھولنے کی سعی کی گئی۔ یوں ہی پہلی مائکرو فکشن کانفرنس میں راقم نے فکشن میں نئی راہوں کی تلاش پر اپنا مقالہ پیش کیا اور یوں اردو ادب میں ایک نئی بحث کا آغاز ہوا۔

افسانچہ..... مائکرو فکشن افتراق

اس موضوع پر مکالمے کی راہ ہموار کرتے ہوئے راقم نے اپنا نکتہ نظر یوں پیش کیا اور سوال اٹھایا ہے:

افسانچہ جو منٹو نے لکھا

اس کا بیانیہ سراسر سیاسی/ طنزیہ فکر سے مغلوب ہے اور اس کی تکنیک عام کہانی کی سی ہے۔

جبکہ مائکرو فکشن

Micro is not in the meaning of Smallest. Mirco is a like a micro chip, that can take million books in it.

یوں ہی اردو میں ہم ایک ایسا متن دیکھتے ہیں جو 300 سے 500 الفاظ پر مشتمل ہو (ایک متفقہ طے حد بعد از مکالمہ)

ایک ایسا text متن جس کی ہر سطر سے کہانی پھوٹے لیکن جو آ کر بنیادی کہانی سے ہی جڑت کرے۔ جو بیک وقت داستان کا لطف، افسانے کا فسوں، علامت کا رنگ اور نظم کا آہنگ لیے ہو... ایک ایسا متن جو ہزار داستان لیے ہو۔

جو مائکرو ہو لیکن اس کا وژن میکرو ہو۔

اور یہ ایک ایسا متن ہو جو Aporia "تعطل "معما" کا عمدہ نمونہ ہو افتراق والتوا اس متن کی ساخت پر مسلط ہو۔

کہیں فکشن تشکیکی حالتوں سے دو چار ہوتا اپنے سگنی فائر اور سنگی فائیڈ ہویت کا حامل ہو۔

بیک وقت کئی کہانیوں کو چھوتا ہوا ایسا متن جو ہر سطر کے متن کو جذب کرتا ہوا اس کی تقلیب بھی کرے۔

اور مجموعی حیثیت میں یہ متن Peradigm کی عمدہ مثال ہو۔

لیکن فکشن جو کہا جائے فکشن کے بھیتر کہا جائے..

(مائکرو فکشن کی کتاب سے مقتبس۔ زیر طبع)

یہ چند نجی کوشش ہیں جن کی ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا۔ اس وقت اکادمی اداروں کی توجہ کی انتہائی ضرورت ہے کہ وہ ادب میں مکالمے کی اہمیت کو سمجھیں اور اس جانب خصوصی دھیان دیں تا کہ ادبا کو ایک میز پر اکٹھا کیا جا سکے اور ادب میں مکالمے کی راہ کو ہموار کیا جا سکے۔

☆☆☆☆☆

''اردو بولی''

اردو ہماری قومی زبان ہے۔ اور یہ بانی پاکستانی قائداعظم محمد علی جناح کا پیغام بھی تھا کہ ''مسلمان قوم'' اردو رسم الخط'' کو اپنائے کہ یہ قرآن پاک کے قریب لاتا ہے اس لیے اس کا ''رسم الخط'' ہم سب پاکستانیوں، بالخصوص مسلم امہ کی سلامتی کا ضامن ہے جو عوام الناس کا فکری اور نظریاتی امین ہے۔'' یہ تو آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ ہمارے پیارے ملک کا نام ''اسلامیہ جمہوریہ پاکستان ہے'' اور یہ ملتِ اسلامیہ عالمی بھی ہے، ''جس طرح ہر قوم کی اپنی زبان ہوتی ہے اسی طرح اردو ہماری قومی زبان ہے۔''

''قوم اس وقت بنتی ہے جب نظریہ ایک ہو'' قائداعظمؒ نے سن 1941 میں اس کو قومی زبان کے طور پر تسلیم کرنے کا حکم دیا تھا۔ تاکہ اردو رسم الخط کی منظوری پوری ذمہ داری اور وفاداری کے ساتھ طے پا سکے۔

''قیام پاکستان سے قبل، برصغیر کے جملہ مسلمان مختلف علاقوں، مختلف قومیں، مختلف زبانیں بولنے والے لوگوں نے اردو زبان کو ''قومی یکجہتی کے استحکام کے لیے اُردو کا انعقاد ضروری سمجھا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ''اس کا فیصلہ آئین میں طے پایا کہ آئینِ پاکستان کی مسلمہ ترین شق کے مطابق ''اردو سرکاری زبان ہونی چاہیے کہ اس کو ہر جگہ، ہر مقام، ہر دفتر اور تمام امور میں پوری انجام دہی کے ساتھ ''اردو زبان'' کو استعمال میں لایا جائے۔ اس لیے بھی کہ اردو کو پاکستان کی قومی و سرکاری زبان قرار دیا ہے کہ زیادہ تر لوگ اردو بولتے اور آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اردو تحریر اپنائیت کا احساس کو محسوس کراتی ہے اس کے باوجود ''پاکستان میں اردو زبان کو سرکاری زبان ہونے کا درجہ حاصل نہیں اور ہمارے ملک کا سارا تحریری نظام ''اردو'' کے بجائے ''انگریزی طرز پر ہے اور انگریزی کو ہی دفتروں میں اولیت حاصل ہے اس لے کہ ہم لوگ انگریزی کو نہ پڑھ سکتے ہیں اور نہ ہی بول سکتے ہیں۔ اور آخر کیوں ہم لوگوں نے انگریزی زبان کو اپنا اہم ذریعہ اور مین ہتھیار بنا لیا ہے اور یہ ہمارے ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ ''مقابلے کا امتحان ''C S S'' بھی

شری مرلی چند / گوپی چند گھوٹکی

انگریزی زبان میں لیا جاتا ہے۔ آپ اس بات کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ''انگریزی زبان اور اردو'' رسم الخط کے فروغ کے لیے قومی المیہ کا اندازہ اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انگریزی ہم پر لاگو ہے۔''

''ہمارے ملک کے چار بڑے صوبے ہیں۔ سندھی، پنجابی، بلوچی اور پشتو زبان جہاں بولی جاتی ہیں۔ ہر علاقے کے عوام اپنی اپنی زبان میں بات کرتے ہیں۔'' ہمیں جاگ پنجابی جاگ ''سندھو دیش'' بلوچستان کی آزادی کی تحریک اور پختونستان کے نعرے چھوڑنا ہوں گے۔ جب تک ہم یہ نعرے نہیں چھوڑیں گے ''ہم ایک قوم نہیں سکتے'' اس فیصلے پر بھی عملدرآمد نہ ہو سکے گا ''پھر اس کو غیر فعال بنانے میں اور آئین کی بے حرمتی اور فیصلے کی بے عملی میں کون قصور وار ہے؟؟

اس کی ذمہ داری کس پر عائد کریں؟؟ کہ اس کی بحالی کی منظوری کیوں نہیں ممکن ہو سکتی ہے؟ جبکہ اس ملک کے میں، صدر مملکت سے لے کر وزیر اعظم۔ چیف جسٹس آف پاکستان۔ چیف آف آرمی سٹاف گورنرز، وزرائے اعلیٰ، وزراء، قومی وصوبائی۔ ارکان اسمبلی ممبران، میئرز، لیڈرز، سیاستدان، قلمکار، شعرا ادبا، علماء، عالم دین اور منتظمین سب کا تعلق مسلم قوم سے ہے، پھر سیاسی، پارلیمانی، انتظامی اور عدالتی مقننہ، نظامی کوتاہیوں اور دیدہ دلیری کا یہ عالم ہے کہ اردو کے نفاذ کی بحالی کے لیے کسی نے بھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اور اردو کے نفاذ کی بات، صرف کاغذی کارروائی تک ہی محدود رہ گئی ہے، جو آج تک اس سے آگے نہ بڑھ سکی ہے۔ اور ہم پاکستانی اردو کے نفاذ کو غیر فعال بنائے ہوئے ہیں کہ اس کی منظوری ہم سب کے لیے سوالیہ نشان بن گیا ہے؟.....؟ کہ آخر کب تک؟ ہم انگریزی زبان کو سرکاری طور پر مانتے رہیں گے اور اردو صرف لوگوں کے درمیان رابطہ کی زبان بنی رہے گی.....! کہ اردو زبان کے سرکاری نفاذ کے حیلے بہانے تلاش کرتے دکھائی دیں گے کہ انگریزی زبان وادب میں، کلچر اور ماحول میں اضافہ ہوتا رہے۔ اس لیے کہ عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اردو زبان ''لشکری زبان'' ہے اور یہ ہندوؤں کا اثاثہ اور ورثہ ہے، جو ہندوستان کے مسلمان لشکریوں کی مقامی آبادی کے ساتھ پاکستان میں پہنچی۔ یہ بات ہندوؤں کے لیے زود ہضم نہ تھی اور ان کے لیے نقصان دہ بھی تھی۔ خاص بات یہ ہے کہ

ہندوستان میں ہندو، اپنی ہندی اور سنسکرت زبانوں کے ساتھ ساتھ ''بالخصوص انگریزی بولی کو زندہ رکھنے میں تو کامیاب رہے اور انگریز کے ساتھ گھل مل کر مسلمانوں کا اسلامی تہذیبی، تہذیب تمدن، تاریخ اور صدیوں سے محیط روایت کو کھو دینے کی سازش میں لگے رہے کہ پاکستان میں اردو زبان باعث بحث و مباحثہ کا ذریعہ بنی رہے اور روایتی حریف موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے رہے اور مسلمان قوم کو سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور ذہنی زخم لگتا رہے کیونکہ گاندھی جی انگریزی میں تقریر کرتے تھے اور ''قائداعظم محمد علی جناح نے بھی انگریزی اور اردو دونوں زبانیں سیکھ رکھی تھیں جو آسانی سے بولتے اور سمجھتے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم ''سندھ مدرستہ السلام' کراچی سے حاصل کی اور قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے انگلستان چلے گئے تھے، اس لیے ان کو دونوں زبانوں میں بڑی مہارت حاصل تھی اور قائد اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ''بھارت'' اپنی اوچھی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔ اور وہ ہندو اور مسلمان ''دو جداگانہ قومیں ہیں'' ''دو نظریاتی'' قومی جھگڑے کو ضرور ہوا دے گا کہ ہم پاکستانیوں کو وہ کسی طرح گمراہ کر سکیں اور بھارت اس ضمن میں انگریز راج کی سرپرستی حاصل کر کے ''ہمیں'' نقصان پہنچا دے اور مسلمان ''ہندو'' انگریز کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا اسلامی تشخص اور ان کی زبان کو ختم کرنے کی سازش میں مشترکہ طور پر کامیابی حاصل کر لیں۔ کیا یہی اصل حقیقت ہے کہ ''بانی پاکستان'' نے بھی اردو سے وابستگی میں کمزوری کا مظاہرہ نہ دکھانے کی خصوصی تلقین اور ہدایت کی تھی اور یہی وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ ''اردو زبان ہمارے حکمرانوں اور عوام کے درمیان صرف رابطہ کی زبان ہے ''جہاں انگریزی زبان مسلمانوں کے لیے مضر اور نقصان دے ہے ''پھر ہم پر انگریزی کیوں مسلط کی گئی ہے۔ جب ایک انگریز کا بچہ اپنی زبان انگریزی میں پڑھتا ہے تو پھر ہم لوگ اردو میں کیوں نہ پڑھیں اور لکھیں، بولیں۔

''ہمارے ملک میں اردو کی دشمن انگریزی ہے تو پھر کیوں نہ ہم اس کو اس کی جڑوں کو زمین سے نکال کر اکھاڑ باہر پھینکیں؟؟.....

اب وقت بھی ہے اور اس فیصلے پر عملدرآمد بھی ضروری ہے کہ اردو کو مضبوط سرکاری زبان اور نظام کی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆

شام پئی بن شام سے سَاہ دی سرگم تک _ تابش کمال کا ادبی سفر

ہور تے کجھ وی پلے نئیں جو دان کراں مَیں
سَاہ وی سَرگم تینڈے نانویں لا کے خوش آں

.....

جارج ویبر کے ''لینگویجز ڈے'' میں چھپنے والے آرٹیکل کے مطابق پنجابی دنیا کی گیارھویں بڑی زبان ہے۔ وکی پیڈیا کے مطابق دس کروڑ نوے لاکھ افراد کی مادری زبان دنیا کی دسویں بڑی زبان ہے۔ دنیا میں ایک محتاط بولی جانے والی زبانوں کی موجود تعداد چھ ہزار نو سو نو ہے لیکن ان میں دو ہزار زبانیں ایسی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار سے کم ہے۔ اگلے سو سال میں متروک ہو جانے والی زبانوں کی تعداد سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے۔ زبان کے ماہرین کے مطابق اوسطاً ہر چودہ دن میں ایک زبان اپنا وجود کھو رہی ہے۔ پنجابی ان زبانوں میں شامل ہے جو یونیسکو کے مطابق مستقبل میں ایسے کسی خطرے سے کوسوں دور ہے۔

بقول خالد مسعود ''جس زبان کے پاس وارث کی ہیر، میاں محمد بخش کی سیف الملوک، شاہ حسین اور بھلے شاہ کی کافیاں اور سلطان باہوؒ کے بیت موجود ہوں وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔''

پنجابی زبان، شاعری، تصوف اور سلطان باہو، خالد مسعود خان ''جنگ'' لاہور 12 جون 2014)

ممتاز محقق قاری حافظ بزرگ شاہ الازہری کی تحقیق کے مطابق حق سبحانہ تعالیٰ نے کم و بیش سولہ ارب ستائیس کروڑ ستاسٹھ لاکھ چھتیس ہزار زبانیں تخلیق فرمائیں (نوائے وقت، ملی ایڈیشن 11 نومبر 2011)

پاک دھرتی پر 35 زبانیں تمام صوبوں میں بولی جاتی ہیں۔ پنجابی صرف پنجاب تک محدود نہیں ہے۔ گزشتہ ماہ برادرم فقیر تابش کمال کا دوسرا پنجابی غزل مجموعہ ''سَاہ دی سَرگم'' تبصرہ، مطالعہ اور ریکارڈ کے لیے موصول ہوا۔ موصوف اردو اور پنجابی کے قادر الکلام شاعر ہیں۔ ماں بولی زبان میں اولیں مجموعہ کلام 'شام پئی بن شام' نومبر 2002 میں شائع ہوا۔ والدہ ماجدہ کے نام منظوم خط بھی 2019 میں کتابی شکل میں منصۂ شہود پر آیا۔ زیرِ نظر خوبصورت شعری مجموعہ میں علاقائی تہذیب و ثقافت، قدیمی تاریخ روایت و جدیدیت نمایاں ہیں۔ دھن کہون، جھینگز و نہار علاقہ جات، صوفیاء عظام، پنجابی کے قد آور شعرا کا تذکرہ، مختصر و طویل بحروں میں نئے استعاروں سے قارئین کو حیرت کدہ پنجابی میں

آفتاب احمد ملک

مقید رکھا ہے۔ یعنی پوٹھوہاری انگ میں مخصوص اشعار پڑھ کر شاعری تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

لاہور کے علاوہ آبائی شہر دلبراں چکوال کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

بھانویں رب دنیا ساری دھرتی سوہنی تے دل کھچیں اے
دنیا اندر گھٹ ای ہوسی شہر کوئی لاہور جیہا
(صفحہ نمبر 59)

دنیا اندر شہر مرے دا تابش کوئی مل ای نئیں
جتھے جاواں دل وچ رہندا، ریساں نئیں چکوال دیاں
(صفحہ نمبر 53)

روحانیت، پنجابی و اردو شاعری وراثتی امانت ہے پروفیسر باغ حسین کمال کی جھلکیاں شاعری و کردار میں ہمارے سامنے ہیں۔ والد ماجد (مرحوم) کی نذر شعر بھی شامل کتاب ہے۔ (صفحہ نمبر 185)

لوکیں آکھن باغؒ نی پگ
تابش سو ہتھے تہاڈے نال

.....

پنجابی کلام کے صوفیاء شعرا کے قبیل کے منفرد قلم کار نے بعض اشعار میں نامور صوفیوں کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے مثلاً (صفحہ نمبر 172)

چپ چپیتے آ بہہ جا
بابا بُلھیا اکھیاں تے
جا کے میرا ناں لکھ دے
دا دیا بُلھیا! اکھیاں تے

.....

پنجابی غزل، نظم، نعت، گاؤن تمام اصناف میں خوبصورت تجربات کیے ہیں۔

ایہہ نظماں، گاؤن دی غیر تے نئیں
پر سکے ساس غزل دے آں
سانوں ہجراں مار مکایا اے
سُکی لکڑی وانگوں بلدے آں

.....

قرآنی آیات کا حوالہ بھی اشعار میں یعنی معرفت و حقیقت کے اشارات ملتے ہیں۔ (صفحہ نمبر 83)

"فیکون" تے سنیا ہویا
تابش آسی "کُن" دا رہناں

.....

"جندڑی لفظ کا تکرار ہر دوسری غزل میں ملتا ہے عشق حقیقی کے اصل اشارت کے بارے میں مجموعہ کا کلام ہی واضح ہے۔ ڈاکٹر احسان اکبر صاحب کی بیک ورق پر جامع رائے 192 صفحات کا ماحصل ہے کہ "کتاب دا ناں تابش نے بے سوجھت نال نہیں رکھ دتا۔ "شاہ" اُس دی فقیری ٹور اے تے "سنگم" اس دا شعری انگ ___

مُتاں بعد اوہ نظریں آیا
ڈھائیں مار کے روئی جندڑی

.....

زیر نظر مجموعہ میں حمد، نعت کے ساتھ 85 غزلیات کا عجیب رنگ ہے۔ صوفیوں کی زبان میں پنجابی رنگ اور روحانی نقطہ نگاہ سے پُرمغز اشعار بہت کچھ سمجھاتے بجھاتے ہیں۔ دل، جسم اور روح کی

وارداتوں کا مختصر بحروں کا تذکرہ حساس قارئین خصوصاً نوجوان شعرا کے لیے مشعل راہ ہے صاحب مجموعہ خود کہتا ہے کہ:

پُھل، شعر، کتاب تے سُر تابش
میں روزِ الست ٹوں منگے سن!

.....

تھل اور سسی کے استعاروں سے دل کی اندرونی شاعرانہ توانیوں کا برملا اظہار کیا ہے۔

تھل دی ریت تے لکھیا ہویا
سسّی ، پنوں ، لبھ دا دُکھ اے
(صفحہ نمبر 23)

تیرا سوہنا تخت سلامت،
مینوں بڈھے رُکھ دا دُکھ اے
تابش سسّی مر ویسی
وت نہ چھیڑیں تھل دی گل
(صفحہ نمبر 39)

چند اشعار جن میں پوٹھوہاری انگ جھلکتا ہے:

دل دا دیوا بال کے رکھاں جسم ہنیرے اُتے
ٹوں جے چرکا گھر آویں نے ہوواں تھوڑی تھوڑی
دل دی مَن کے تابش اکھ وا سچا سودا کیتا
تینوں سوچ کے پیر میں دھریا پیار دی پہلی پوہڑی

.....

سچا عاشق ازلاں ٹوں
سبھ کجھ پڑھیا ہویا سی
مجھاں، دُھلی، کیدو، خورے کتھے نیں
میں رانجھن دی تہر سنبھالی پھرناواں
تابش اپنی خال مخولی مُٹھی وچ
بس اپنی تقدیر سنبھالی پھرناواں

مجازی و حقیقی عشق کی عجیب و غریب واردات کو صوفی شاعر اپنی مادری زبان میں گنگناتا نظر آتا ہے۔ فکراں والا پھولا کوہجا عملاں والا خالی بوہجا

عشق دا سوہنا ناواں جپیا سودا لبھیا سستے وچ
اکھیاں دے وچ چانن آیا خورے لے کنے گون سنایا
ساہواں وچ دھمالاں پائیاں دل کملا سی مستے وچ
(صفحہ نمبر 124)

ممتاز نقاد و شاعر ڈاکٹر احسان اکبر، سلیم کاشر اور نہال بخت کمال کی آرا شامل مجموعہ کلام پنجابی میں۔ پنجابی شاعری کی معیاری اور خوبصورت کتابوں میں "سَاہ دی سرگم" کا اضافہ باعث طمانیت ہے۔

فرنٹ ٹائٹل مجموعہ کے نام کی مناسبت سے عیاں ہے۔

اشاعتی ترتیب سے فقیر تابش کمال کی ساتویں کتاب ہے۔ نثری شاہکار الگ ہیں۔ قومی سطح کے اس قادر الکلام شاعر، خطاط، مصنف، صوفی اور نقاد لاریب اس نئے سال میں نئے شعری مجموعے کی اشاعت پر دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

معروف اشاعتی ادارے کمال پبلی کیشنز، راولپنڈی نے سفید کاغذ اور دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ شائع کیا ہے۔ بیک ورق پر فاضل شاعر کی رنگین تصویر قارئین ادب سے ہم کلام ہے۔

دنیا دا کیہہ سنگ کراں میں دنیا اے کجھ ہور جہی
مینڈیاں نیتاں ہور جہیاں نیں، میں آں بندہ ہور جہیا

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی نثر نگاری

عالمِ اسلام کی خدمات کے حوالے جو شخصیات ہمیشہ زندہ و جاوید رہیں گی ان میں ڈاکٹر قدیر خان کا نام یقیناً سرفہرست ہو گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر صاحب اس وقت پاکستان کی سب سے اہم، معزز اور مشہور شخصیت تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے دفاعی لحاظ سے وطن عزیز کو جس مقام پر لا کھڑا کیا ہے وہاں تک پہنچنے کی خواہش میں تو کئی ممالک صفحہ ہستی سے ہی مٹ گئے۔ ان کے دفاعی اور فلاحی کاموں کی ایک لمبی فہرست ہیں۔ مگر مجھے آج ان کی ادبی، علمی اور قلمی خدمات کے حوالے سے گفتگو کرنی ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب ایک کتاب دوست آدمی تھے انہیں کتابیں اور کتابی چہرے اچھے لگتے تھے۔ جن کا تذکرہ وہ اکثر اوقات اپنے کالموں میں کیا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو نثر نگاروں میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایک بلند اور منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں سلاست اور روانی، تخیل کی صاف گوئی، زباں کی شیرینی، حسن اور خوبصورتی پائی جاتی۔ وہ اپنی تحریروں میں الفاظ اور محاورہ کے استعمال میں توازن اور تناسب کا بھرپور خیال رکھتے۔ ان کی تحریریں تصنع اور تکلف سے پاک اور باغ و بہار شخصیت کی طرح سدا بہار تھے۔ بقول اعتبار ساجد:

تجھ سے لفظوں کا نہیں روح کا رشتہ ہے مرا
تو مری سانس میں تحلیل ہے خوشبو کی طرح

.....

ڈاکٹر عبدالقدیر خان بھارت کے شہر بھوپال میں 27 اپریل 1936 کو عبدالغفور خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ وہ اکثر کہتے کہ ”بھوپال آج بھی جنت ہے۔ بھوپال سے زیادہ خوبصورت جگہ ہندوستان میں کہیں نہیں، بھوپال کے لوگوں سے اچھے لوگ کہیں نہیں۔ ان کے والد درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ تھے جن کا شمار اُس وقت کی مشہور علمی شخصیات میں ہوتا تھا۔ ان کی والدہ گھر میں بچیوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتی اور غریب بچیوں میں

صدام ساگر

پیسے اور کپڑے بھی تقسیم کرتی۔ اسی لیے فلاحی جذبہ ابتدا سے ہی خاندان میں تھا۔ کامران امجد خان اپنی کتاب ''مشہور عالمی شخصیات'' میں لکھتے ہیں کہ ''ڈاکٹر صاحب کو بچپن میں مچھلی کے شکار اور تیراکی کا بہت شوق تھا اور اس شوق کی تکمیل وہ گھر کے قریب واقع تالاب سے پوری کرتے تھے۔ چھوٹی موٹی شرارتیں بھی کرتے تھے۔ انہیں مطالعہ سے بہت شغف تھا۔ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ رہا۔ اسلامی ناولوں کو بہت شوق سے پڑھتے تھے۔''

ڈاکٹر صاحب اپنے لڑکپن میں اکثر کہا کرتے تھے کہ ''میں کوئی ایسا کام کروں گا جس سے میری قوم کو اور مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔'' قیام پاکستان کے بعد وہ لٹے پٹے کراچی آ گئے اور محلہ رام سوامی میں رہائش اختیار کی۔ انہوں نے ڈی جے ایس کالج میں داخلہ لیا اور تعلیم کے حصول میں مگن ہو گئے۔ انہوں نے اپنے قلم سے نظریہ پاکستان، تاریخ، تعلیم، ادب، زبان و بیان، اسلام اور فلسفہ سائنس جیسے موضوعات پر بہت سے مضامین سپرد قلم کیے جو ملک کے معروف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئے۔ ان کے مضامین کے مطالعہ سے ان کی وسعت معلومات اور دقیق علمی دسترس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے مضامین کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں کو نہ صرف فکری طور پر محرک کرنا چاہتے تھے بلکہ عمل کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ عمل کی یہ ترغیب ان کے جذبہ خلوص اور دردمندی کی آئینہ دار تھی انہیں قومی اور وطنی ضرورتوں کا ایک سچے پاکستانی اور محب وطن ہونے کی حیثیت سے پورا پورا ادراک ہے اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ پاکستان دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہو جائے اور انہوں نے ایسا سچ میں کر کے دکھایا جسے پھر پوری دنیا نے نہ صرف دیکھا بلکہ تسلیم بھی کیا۔ افسوس کے انہیں پاکستان کو ایٹمی ریاست بنانے کا صلہ ''نظر بند'' ہونے کی صورت میں دیا گیا۔ جس پر ڈاکٹر فرماتے ''کہ جن لوگوں پر ہم نے احسان کیا اُن ہی بدمعاشوں نے مجھے میری نواسیوں، بیٹیوں اور بہن بھائیوں سے چار چار ماہ تک بھی ملنے نہ دیا۔ اس ملک کو ہم نے جو کچھ دیا اُس کے بدلے میں جو صلہ ہم کو ملا اُس کے بعد ہم نے قسم ڈال لی کہ اب ہم کچھ نہیں بنائے گے ہم قوم سے نہیں ناراض۔ میں اُن حسان فراموش اور نمک حرام لوگوں سے خفا ہوں جنہوں نے اس ملک کو لوٹا۔'' ایسے میں داغ دہلوی کا شعر یاد آیا:

تماشا جب سے دیکھا ہے مرے دل کے تڑپنے کا
تماشا ہے کہ وہ اپنی نظر سے آپ ڈرتے ہیں

ڈاکٹر صاحب جہاں عمدہ نثر نگار تھے وہیں بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ مگر اُن کا زیادہ تر رجحان نثر لکھنے کی طرف رہا۔ ان کے پسندیدہ شعرا میں غالب، مومن، مصحفی، جگر، جوش، اقبال، مجاز، فیض، فراز جنہیں وہ اعلیٰ پائے کے شاعر تسلیم کرتے۔ جبکہ اختر شیرانی کی رومانی شاعری کے بہت گرویدہ تھے۔ علم و ادب کی تعلیم انہیں گھر سے ہی ورثہ میں ملی اور سائنس ان کا سائیڈ مشغلہ ٹھہرا۔ انہیں آٹو بائیو گرافی اور اسلامی کتب پڑھنے کا بہت شوق

تھا۔ ان کے پسندیدہ گلوکاروں میں منی بیگم، اقبال بانو، عابدہ پروین اور غلام علی خاں شامل ہیں۔ ''سحر ہونے تک'' یہ کتاب ان کے منتخب کالموں کا مجموعہ ہیں۔ ان کالموں کو ہفتہ وار شائع کرنے کا اعزاز پاکستان کے معتبر قومی اخبار ''جنگ'' کو حاصل رہا۔ ان کا آخری کالم انکی وفات کے اگلے روز ''نعمتِ الٰہی'' کے عنوان سے شائع ہوا اس کالم کی چند آخری سطریں دیکھیے:

'الحمدللہ اب پہلے سے صحت بہت بہتر اور خطرے سے باہر ہے صرف تھوڑی کمزوری ہے ان شاء اللہ وہ بھی جلد دور ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب کبھی مجھے تنہا نہ چھوڑے گا۔''

ان الفاظ کو پڑھنے کے ابھی سب منتظر تھے کہ 10 اکتوبر 2021ء کی سحر ہوتے ہی وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جس سے پاکستان کا روحانی باپ فوت ہو گیا اور یقیناً ان کی وفات ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ محسن پاکستان ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے کیونکہ زندہ قومیں اپنے محسنوں کو کبھی فراموش نہیں کرتیں۔ ایسے موقع پر وسیم عالم کا شعر یاد آ رہا ہے کہ:

جنہیں مل کر دلی راحت ملے ہم کو
یہی وہ لوگ ہیں جو یاد رہتے ہیں

.....

ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہمارے لیے سرمایہ افتخار تھے اور ہمیشہ رہے گے کیونکہ انہوں انہوں نے وطن عزیز کو سر اُٹھا کر چلنے کا حوصلہ دیا۔ انہوں نے دفاعی لحاظ سے وطن عزیز کو ناقابل تسخیر بنا کر دشمن پر یہ واضح کر دیا کہ اگر خدا پر مکمل بھروسہ ہو تو پھر ''مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔'' پاکستان کے معروف صحافی، کالم نگار سہیل وڑائچ کے پروگرام ''ایک دن جیو کیساتھ'' میں ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ ''کارگر کی جنگ میں پرویز مشرف نے جو بیوقوفی کی تھی'' آبیل مجھے مارنے والی'' اس کے بعد پاکستان پر آج تک کوئی آنچ نہیں آئی، یہ نشانِ امتیاز میں نے چوروں اور ڈاکوں کے ہاتھوں تھوڑی لیا۔ یہ میں نے اپنی محنت سے لیا۔'' ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا غم زدہ لمحہ تھا جب انہیں نظر بند کیا گیا اور خوشی کا وہ لمحہ جب غوری مزائل کا کامیاب تجربہ کیا اور برسوں کی محنت رنگ لائی جس سے پاکستان ایٹمی قوت بن گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی ساری بیش قیمت حصہ جس عظیم مقاصد کے حصول میں صرف کیا اسے آج پوری قوم عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور ان کی عظمتوں کو سلام پیش کرتی ہے۔ مگر وہیں افسوس کا مقام یہ ہے کہ زندہ تھے تو نظر بند۔ مر گئے تو محسن پاکستان---- آخر میں ڈاکٹر صاحب کے اس شعر کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

گزر تو خیر گئی ہے تیری حیات قدیرؔ
ستم ظریف مگر کوفیوں میں گزری ہے

☆☆☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر رانی آکاش کی کتاب لاعورت

لاعربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی نہیں کے ہیں۔اب اس نہیں کا معنی بہت وسیع ہے۔اس معاشرے کے منفی رویے، انکار، دھتکار، محرومیاں اس مختصر لفظ لا میں کہیں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔لاعورت کے عنوان سے جب افسانوں کی ایک کتاب میرے ہاتھوں میں آئی، تو پہلے میں اس عنوان کا پس منظر کھوجنے کی جستجو کرنے لگی جو کہ اس کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر رانی آکاش نے تو ہرگز بیان نہیں کیا تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا کہ رانی آکاش نے عنوان کے ذریعے اس معاشرے کی ایک تلخ حقیقت واضح کردی ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ عورت ہیں تو اس معاشرے میں رہنے کے لیے آپ کو اپنے عورت ہونے کی نفی کرنا ہوگی۔یا دوسرا معنی جو میری ناقص عقل میں وارد ہوا وہ یہ کہ مرد اس معاشرے میں فقط اپنی اجارہ داری چاہتا ہے اور عورت کے وجود کو یا تو سرے سے تسلیم کرتا ہی نہیں یا پھر محض اس کو اپنی تسکین کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔

بحرحال افسانوں کی اس کتاب کو پڑھ کر مجھے بیک وقت منٹو، عصمت چغتائی، پریم چند، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر کے پڑھے گئے افسانوں سے مماثلت نظر آئی۔

افسانوں کی اس کتاب میں کم وبیش سترہ افسانے شامل ہیں۔اس کتاب کا انتساب اباجی کے نام کیا گیا ہے۔جبکہ جناب ڈاکٹر انوار احمد اور محترمہ ڈاکٹر طاہرہ اقبال نے اس کا دیباچہ تحریر کیا ہے۔علاوہ ازیں رانی آکاش نے کچھ باتیں کے نام سے شروعات میں کچھ باتیں کی ہیں۔

رانی آکاش نے افسانوں کی اس خوبصورت کتاب میں ہمارے معاشرتی مسائل کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔

سیدہ آمنہ ریاض

مردوں کی بے جا اجارہ داری ان کے ایک افسانے فطرت کے شروعات میں دکھائی دیتی ہے:

مثل مشہور ہے کہ فطرت کبھی نہیں بدلتی اور خاص طور پر اگر مرد کی فطرت ہو تو ذرا مشکل ہی سے بدلتی ہے کیونکہ حکم چلانا اور دوسرے کو تابع رکھنا اس کی سرشت میں شامل ہے۔ بیٹا ہو تو گھر میں بیٹیوں پر فوقیت، بھائی ہے تو بہنوں پر فوقیت، شوہر ہے تو بیوی پر دھونس اور خواہ مخواہ کا رعب و دبدبہ۔ اس کی یہی فطری خواہش اسے گھر کی چار دیواری سے نکال کر گلی محلے، شہر، ملک اور پھر عالمگیر برادری پر حکم چلانے کی ترغیب دیتی ہے۔

ایک اچھے اور منجھے ہوئے افسانہ نگار کی یہ خوبی ہے کہ وہ کرداروں کو کچھ اس طرح پیش کرے کہ وہ آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آئیں۔ رانی نے اپنے افسانے کے کرداروں کو بڑے پیار سے تراشا ہے اور شائد اسے ان کرداروں پر بڑا مان بھی ہے ملاحظہ کیجیے افسانے باسٹرڈ کے کچھ جملے:

اس کے گھنگھریالے بال چھوٹے چھوٹے چھلوں کی صورت میں اس کے لمبوترے چہرے پر گرے رہتے تھے جن سے اس کا چہرہ دلکش دکھائی دیتا تھا۔ وہ قوسوں بھرے جسم والی لڑکی تھی۔ بہت سوفٹ، بہت فلیکسی بل، اس کی چال میں زگ زیگ تھے۔

رانی نے راجندر سنگھ بیدی کی طرح جولیا کے کردار کی وضاحت خوب کی۔

اور لاجو ایک پتلی شہتوت کی ڈالی کی طرح، نازک سی دیہاتی لڑکی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سنولا چکا تھا۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بے قراری تھی۔ اُس کا اضطراب شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ کر اس کے بڑے سے پتے پر کبھی ادھر اور کبھی اُدھر لڑھکتا رہتا ہے۔

(لاجونتی از راجندر سنگھ بیدی)

رانی خود بہت گہری عورت ہے۔ آپ اس کو ڈسکور نہیں کر سکتے۔ جیسے جیسے آپ اس کے قریب آتے ہیں ویسے ویسے اس کی ذات کی گہرائی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کے لکھے گئے افسانوں میں بھی سمندروں جیسی گہرائیاں ہیں۔ ایک ایک جملے کے کئی معنی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ چند جملے ملاحظہ فرمائیے:

اووں۔ وہ مچل رہا تھا ہمیشہ کی طرح سے اور میں ایک بار پھر پانی کی صراحی بنی اس کے لیے شیشے کے گلاس ڈھونڈ رہی تھی۔

(تیرے وعدے پہ جئے ہم)

کہانی بغیر ٹائٹل کے ادھوری رہ گئی تھی۔

(باسٹرڈ)

کچا گھر پکا ہو گیا مگر ---- کچھ بھی پکا نہ رہ سکا۔

(اماں جی)

رانی نے افسانے کے تمام لوازمات (پلاٹ، کردار، منظر نگاری، المیہ، اتار چڑھاؤ) کو بہت اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں امیری، غریبی، نفسیات، جنس، بے راہ روی، دھونس جیسے معاشرتی مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

اگر آپ رانی سے عام زندگی میں ملیں گے تو آپ کو اردو ادب سے مطابقت اور رکھ رکھاو رکھنے والی عورت ملے گی۔ لیکن ان افسانوں میں اس نے بہت سے ڈھکے چھپے موضوعات پر بے ساختہ قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس کی وجہ شائد یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں جنس، جذبات اور احساسات کی وضاحت دینا یا الفاظ میں ڈھالنا جرم سمجھا گیا ہے۔ لیکن رانی آکاش ایک ایسی افسانہ نگار ہے جو انسانی جذبات، احساسات اور نفسیات کو بخیر و خوبی سمجھتی ہے۔ اس کا اپنا کہنا ہے کہ یہ افسانے میری عمر بھر کی پونجی ہیں اور واقعی وہ ان افسانوں کے ذریعے نہ جانے کتنا کچھ کہہ گئی ہے۔

وہ سمجھتی ہے کہ اگر شوہر بے وفائی کرے تو عورت کے دل پہ کیا گزرتی ہے، وہ سمجھتی ہے اگر ایک عورت محض لڑکیاں ہی جنے تو اس کو بیٹا نہ ہونے پر کیا کیا نہیں سننا پڑتا، وہ سمجھتی ہے کہ طلاق ہونے پر ایک عورت جیتے جی زندہ گاڑ دی جاتی ہے، وہ سمجھتی ہے کہ مردوں کے اس نام نہاد معاشرے میں عورت کو جگہ جگہ ہریسمنٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بقول اس کے دل کی بات قاری سے نہیں کہے گی تو کس سے کہے گی؟ اس لیے اس نے معاشرے میں عورت پر ہونے والی ہر ناانصافی کو من و عن قاری کے سامنے لا کھڑا کیا۔

خواہ افسانے ماں جی کی ست بھرائی ہو، باسٹرڈ کی جولیا، گرتو غم گسار ہوتا کی عنبرین ہو، تیرے وعدے پر جئے ہم کی رابعہ ہو، ابن افلاس کی صادقہ ہو، خواتین کے ان کرداروں کے ذریعے رانی نے عورت کے جذبات اور نفسیات کی بہترین عکاسی کی ہے۔

لاعورت معاشرے میں رہنے والی ہر عورت کی کہانی ہے۔ یہ وہ کہانی ہے جو ہمارے اردگرد ہمہ وقت موجود ہے لیکن ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ رانی نے کمال خوبی سے انہی کرداروں کو تراشا ہے کہ وہ واضح ہو کر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔

میں رانی آکاش کو ان کی اس کتاب کے منظر عام پر آنے کے لیے بہت مبارکباد دینا چاہوں گی۔ اللہ پاک ان کو مزید کامیابیوں اور کامرانیوں سے نوازے۔ آمین

☆☆☆☆☆

میرا جی اور شونیتا کا تصور

وحشت میں انسان کا آخری سہارا مذہب ہوتا ہے اور جس کے پاس یہ سہارا نہ ہو تو اس کی داخلی شخصیت ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ میرا جی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا انھوں نے اپنی وحشت کو خود پر طاری کر لیا اور اسی وحشت نے انھیں ختم کر دیا۔ میراں جی کے ظاہری حلیے کا پراگندہ پن، ان کی عجیب عادتیں، صاف گوئی اور غربت نے انھیں لوگوں کی نظروں میں منفی تاثرات کی حامل ایک مجہول سی شخصیت بنا دیا تھا۔ لوگ ان کے من میں چھپے حساس دل تک نہ پہنچ سکے اور میرا جی مر گئے۔

میرا جی کی شاعری اور ان کی نظموں کی انوکھی فضا، ان کے مضامین میں تنوع، ان کی وسیع سوچ اور جدیدیت سے بھرپور تنقیدی شعور نے انھیں اردو ادب کے جدید شاعروں کی پہلی صف میں لا کھڑا کیا۔

میرا جی کی شخصیت نفیِ ذات کا منہ بولتا ثبوت تھی اور ان کی شاعری اس سے بھی آگے کی چیز ہے۔

میرا جی کے شعور نے انھیں مصرعوں کی کانٹ چھانٹ سے آزاد کیا اور نظریہ شونیتا نے ان کے الفاظ کو امر کر دیا۔ شونیتا یعنی سوچنے کا ایسا قاعدہ جس کی رُو سے ایک ایسی سوچ تک آگہی کہ اس کائنات میں کچھ بھی، یعنی کوئی شے، کوئی بھی خیال، کوئی بھی نظریہ، کوئی بھی تصور، کوئی بھی اصول قائم بالذات نہیں ہے یعنی کسی شے کی کوئی اصل نہیں ہے۔ شونے کا مطلب ہندی میں صفر ہے۔ مطلب زیرو۔ شونیتا شونے سے ہے zero جو ایک عددی علامت ہے۔ شونیہ کے ایک معنی تو یہ ہے کہ 0۔ یعنی کہ نہیں ہے۔ اس کے مطابق اس کائنات میں موجود ہر چیز معدوم ہے۔ ہر شے پر غیاب کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ حقیقت کی اصل محض ایک واہمہ ہے۔ اپنی مطلق حیثیت سے شونیتا انسانی وجود میں (جو عارضی وجود ہے) عدم وجودیت یا آزادی مطلق کا احساس ہے۔

اس آزادی کے احساس کو میرا جی نے اپنی شخصیت پر بھی طاری کیا اور اپنے فن میں بھی اس کو لاشعوری طور پر برتا ہے۔ لیکن اس کی بنیادیں شونیتا کی جڑوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ شونیتا کی یہ نفی محض ''نہیں'' میں نہیں ہے بلکہ وجود یا وجود کے احساس سے ورا جو وجود ہے اس کا احساس ہے، اس کی نفی بھی ہے۔ شونیتا کے تصور کو بہتر طور سمجھنے کے لیے ہمیں یوں سمجھنا چاہیے کہ حقیقت یا وجود اپنی جگہ پر ہے لیکن شونیتا کی فہم کے بغیر اس کا علم ممکن نہیں ہے شونیتا انسانی وجود میں (جو عارضی

نادیہ عنبر لودھی

وجود ہے) عدم وجودیت یا آزادی مطلق کا احساس ہے۔ اسی آزادی کے احساس کو جینے کی کوشش میں میرا جی نے اپنی عجیب وغریب وضع قطع بنا کر اپنی ذات کی نفی کرنے کی کوشش کی۔ وہ شونیتا کے تصور سے بخوبی واقف تھے ان کے اشعار پر ہندی کے اثرات واضح ہیں الفاظ کے چناؤ سے خیالات تک۔ وہ خود کو ایک آزاد روح سمجھتے تھے لیکن جب آزاد ہو نہیں پاتے تھے تو اپنی نفی کرنے لگتے یہ ہی انداز اُن کی نظموں کی انفرادیت ہے۔

اندرونی کشمکش بیرونی ماحول کی شدت پسندی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتی بلکہ نفی اور اثبات کا کھیل کھیلتی رہتی ہے۔ یہ ہی کھیل میرا جی کے وجود میں جاری رہتا تھا کبھی ان کے من موجی فطرت حاوی ہو جاتی اور کبھی زیر۔ جس کا اندازہ میرا جی کی حالت ناگفتہ بہ سے ہوتا۔ وحشت کی بھرمار ان کے وجود میں ایسی آگ بھر دیتی کہ وہ اس آگ کو آنسوؤں سے بجھانے لگتے۔ سکون اور کیف کے لیے شاید ان کے پاس اور کوئی حل نہیں تھا یا وہ وجود کی نفی کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔ شونیتا کے تصورات میرا جی کے مضامین میں بھی نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں۔ ان کی نظر مغربی تنقیدی افکار پر بہت گہری تھی اور نظم نگاری کے فن سے وہ بخوبی واقف تھے۔ ان کی نظمیں گہری معنویت لیے ہوئے ہیں جن کی تہہ میں کئی عناصر بکھرے ملتے ہیں جن میں نفی کا جذبہ شدت سے اُبھرتا چلا جاتا ہے اور اثبات کی طرف بڑھتے ہوئے ان کے قدم روک دیتا ہے وہ صفر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر سوچتے ہیں کہ سب شونے ہے۔ لیکن وہ آس اور امید کا دامن بھی تھامے رکھتے ہیں۔

میرا جی کے چند مصرعے

کیوں خواب فسوں گر کی قبا چاک نہیں ہے
کیوں گیسوئے پیچیدہ درقصاں
نمناک نہیں ہے
اشک دل خوں سے
کیوں لمس کی حسرت کے جنوں سے
ملتی نہیں مجھ کو
بے قید رہائی
ملبوس پہ کرنوں کی تمازت
ہے دام نظر کا
اور صبح شب عیش کو گیسو کا مہکتا ہوا جھونکا
مرہون سحر کا
ہوتا ہی نہیں ہے
کیوں دھوئے نہ پیراہن آلودہ کے دھبے
مخمور مسرت
کرنوں کی تمازت
بن جائے نہ کیوں رنگ شب عیش کا اک عکس مسلسل
مجبور اذیت
تو مان لے اس عکس کا منظر
دیتا ہے تجھے جام چشیدہ کی سی لذت
کیوں سوچ رہا ہے
جھوٹا ہے یہ پیالہ

(میرا جی)

☆☆☆☆☆

ساحل پہ کھڑے لوگوں میں سے ایک میں

معزز خواتین وحضرات!

شاعری کے مجموعے کا شائع ہونا، ایک عام سی بات ہے مگر کچھ مجموعے ایسے ضرور ہیں جن کی اشاعت کی خبر جہاں بہت خوشی عطا کرتی ہے وہاں بہت زیادہ حیرت کا باعث بھی بنتی ہے کہ شاعر موصوف ہنستے بولتے، چلتے پھرتے، لوگوں کو ہر لمحہ افسر اعلیٰ دکھائی دیتے رہے۔ کبھی سرکاری گاڑی میں نظر آتے کبھی وردی میں، پاکستان کی مختصر تاریخ میں وردی کی اہمیت اور افادیت سے ہر شخص واقف ہے۔ ایوب خان سے لے کر پرویز مشرف تک وردی ہی کی زردی نظر آتی ہے مگر شعراء وادبا میں کرنل شہزاد نیر، کرنل طلعت شبیر، جنرل عارف، کرنل صدیق سالک، کرنل محمد خان، کرنل اشفاق حسین، شوکت ہاشمی، اطہر حسن ندیم، اکرم سحر فارانی، کو دیکھنے کے بعد ادب میں وردی کم ہی نظر آئی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شاعر ادیب یا تو وردی کے نیچے دب جاتا ہے یا وردی کے اوپر چڑھ کر دوسروں کو اُوے اُوے کر کے چھیڑتا ہے، مگر آج کی وردی یہ عام پولیس کی ہے نا خاص فوج کی یہ وردی ہے ایف آئی اے کی اور شاعر ہیں محترم تاثیر نقوی۔

تاثیر نقوی واحد مثال ہیں جو وردی کے نیچے دبے نہ ہی وردی پر چڑھ کر لوگوں کو اُوے اُوے کہا بڑے خانوادے سے تعلق نے تاثیر نقوی کو غرور میں مبتلا کیا نہ ہی بڑے بڑے تعلقات نے انھیں چھوٹا کیا۔

تاثیر نقوی بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں یہاں بھی انھوں نے کبھی چھوٹے بڑے کا سابقہ اور لاحقہ نہیں لگایا۔ بس شاعر بنے رہے اور شاعری کرتے رہے پھر جو ذرا فرصت ملی تو اپنے کلام کو یکجا کرنے کے بعد ساحل پہ کھڑے لوگ، کے نام سے شائع کر دیا۔ اُسی مجموعے میں ایک دوست کی حیثیت سے میں نے بھی ایک ورق لکھا، جو یقیناً چاندی کے ورق جیسا نہیں مگر میرے لیے ایک اعزاز ہے مجھے پورا یقین ہے کہ ابھی تک میرا لکھا ہوا کسی نے نہیں پڑھا

اعجاز رضوی

ہوگا، سو میں پورے یقین کے ساتھ اپنا لکھا آپ کو سنا رہا ہوں۔

سچی لگن کی بہترین مثال

معروف شاعر ادیب کالم نگار ادب دوست اور ادب نواز سید تاثیر نقوی ایک علمی اور ادبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں اُن کا تعلق آبروئے غزل میر ثانی ناصر کاظمی کے خانوادے سے ہے جو کہ رشتے میں ان کے والدین کے کزن ہیں اسی نسبت سے انھیں شاعری سے ایک خاص شغف رہا ہے تاثیر نقوی کی ادب سے انسیت اور محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ دیگر ادبی تنظیموں کو خیر باد کہہ کر ادب کی ترویج کو ترقی کے لیے قائم کی گئی۔ 83 سالہ قدیمی ادبی تنظیم حلقہ ارباب ذوق پاک ٹی ہاؤس سے وابستہ ہوئے، اور مجلس عاملہ کے فعال رکن کی حیثیت سے سامنے آئے۔

اسی لیے آپ حلقہ ارباب ذوق کے ہر اجلاس میں بہت ذمہ داری سے شرکت کرتے ہیں خاص طور پر مشاعرے میں تو اپنی شرکت کو خود ہی یقینی بنانے کے لیے دوستوں کو یاد بھی کرواتے ہیں کہ آج مشاعرہ ہے ضرور آنا، میں بھی آ رہا ہوں، مشاعرے میں ان کی ضد ہوتی ہے کہ مجھے پہلے بلاؤ، کیوں کہ میں مجلس عاملہ کا رکن ہوں اور شعرا کرام کا میزبان ہوں، حلقہ ارباب ذوق اور ان کے اراکین سے تاثیر نقوی کا ایک خاص دلی تعلق ہے، جس کو نبھانے میں یہ اپنی مثال آپ ہیں، یہاں میں آپ کو تاثیر نقوی کے کچھ اشعار سنانا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں:

جلے چراغ دیکھ کر
ذرا امید سی ہوئی

دکھائی دے نہیں رہا
عجیب روشنی ہوئی

یہ مجھے علم ہے تیرے بغیر
کام کیسے مجھے چلانا ہے

پھول کو شاخ سے جدا مت کر
میں نے نغمہ ابھی سنانا ہے

ابھی دیوار کی نظر میں ہے
بات گھر کی ہے اور گھر میں ہے

روح تک روشنی اتر جائے
گر سہارا مرا بنیں آنکھیں

معزز خواتین و حضرات تاثیر نقوی کے بارے میں، میں نے اور کیا لکھا ہے، یہ آپ کتاب میں پڑھ لیں سارا لکھا میں نے ہی سنانا ہے، تو پھر تقریب کا مہمان خصوصی بننے کا کیا فائدہ اب میں فائدے نقصان سے بالا ہو کر، اس تقریب کے میزبان مظہر جوکا، اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور خاص طور پر تاثیر بھائی کو ان کے پہلے مجموعہ کلام ساحل پہ کھڑے لوگ کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور انہی کے شعر پر اختتام کرتا ہوں:

ہے سامنے مرے تیری یادوں کا سمندر
لگتا ہے مجھے پار انہی لہروں کے سہارے

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے نلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داشان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

ایشیا کی سب سے بڑی کیمل ریس:

شیخ زید وہاں تیس روز رہے۔ ان کے جانے سے پہلے اطلاع آئی کہ فلاں روز صحرا میں "کیمل ریس" ہوگی۔ ہز ہائی نس نے ہمیں مدعو کیا تھا۔ جب ہم وقت مقررہ پر پہنچے تو عجیب منظر دیکھا۔ ایک وسیع و عریض میدان میں دنیا کی سب سے بڑی اُونٹ دوڑ کا انعقاد کیا جا رہا تھا۔ پچاس ہزار لوگ میلے میں شریک ہوئے۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ ان کو اتنی جلد خبر کیسے ہوگئی۔ صحرا میں کوئی ٹیلی کمیونیکیشن سسٹم تو نہیں ہوتا لیکن خبر ہوا کے ساتھ اُڑ کر پہنچ جاتی ہے۔ ڈھول بج رہے تھے۔ لوگ رنگ برنگے لباس پہنے اور رنگین

پگڑیاں باندھے ناچ رہے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں چولستانی اونٹ ٹولیوں میں بٹے دوڑنے کے لئے تیار تھے۔ اس کے علاوہ بے شمار بیل گھوڑے اور گدھے بھی مقابلے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ ریت کے ایک اونچے ٹیلے پر شامیانے نصب کیے گئے تھے۔ ایرانی قالینوں پر سفید براق چادریں بچھی تھیں۔ عرب شیوخ ڈرائی فروٹ اور قہوے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سب کو شیخ زید کی آمد کا انتظار تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جس کا چولستانی سارا سال انتظار کرتے ہیں۔ عرضیاں، درخواستیں، مسائل پیش کرنے کا وہ نادر موقع ہوتا ہے۔

دور سے گرد و غبار کا بادل اُٹھا تو سب سمجھ گئے کہ شاہی سواری آ رہی ہے۔ تمام فضا اللہ اکبر اور شیخ زید زندہ باد کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ چار سو شہنائیاں بجنے لگیں۔ ڈھول کی تھاپ تیز ہو گئی اور رقص کرتے ہوئے قدم تیز تر۔ تربیت یافتہ اُونٹوں اور گھوڑوں نے بھی ناچنا شروع کر دیا۔ شیخ کے گاڑی سے اُترتے ہی خدمت گاروں نے نوٹوں سے بھرے ہوئے سوٹ کیس بھی اُتار لئے۔ اونٹوں کو بیس ٹولیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اسی طرح گھوڑوں، بیلوں اور گدھوں کی بھی درجہ بندی کی گئی۔ ہر گروپ میں اوّل دوم اور سوم آنے والے جانوروں کو نہ صرف بھاری انعامات دیئے جاتے ہیں بلکہ محل انہیں خرید بھی لیتا ہے۔ شرکائے میلہ کو مبلغات کی شکل میں ''مہمانی'' دی جاتی ہے۔ ان کے کھانے پینے کا بھی خاطر خواہ انتظام ہوتا ہے۔ صحرا میں چار سو دیگیں ہی دیگیں نظر آتی ہیں۔ ناچ میں اول دوم اور سوم آنے والے جانوروں کو بھی انعام دیا جاتا ہے۔ ان کو بھی خرید لیا جاتا ہے۔ اس سارے میلے کا مقصد جانوروں کی افزائش نسل اور چولستانیوں کے مسائل سے آگاہی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ وہیں فیصلہ ہوتا ہے کہ اس سال صحرا میں ٹوبے (تالاب) کتنے بنتے ہیں، کتنے سو کنوؤں کا احداث ہونا ہے اور واٹر پائپ لائین کو کہاں تک توسیع دینی ہے۔

تین گھنٹوں تک مختلف دوڑیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد نیزہ بازی ہوئی۔ پھر ڈھول پر جانوروں کا رقص ہوا۔ شیخ زید نہایت خوشگوار موڈ میں تھے۔ لطیفے سناتے رہے۔ ظفر اقبال ترجمہ کرتے کرتے بعض اوقات شرما جاتا اور اس کے گال سرخ ہو جاتے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ترجمہ بلا کم و کاست کرے۔ لطیفے میں جب تک تھوڑی بہت برہنگی نہ ہو وہ لطیف نہیں رہتا حکایت بن جاتا ہے۔ سہ پہر کو جب پروگرام ختم ہوا تو ہم خوشگوار یادیں لے کر واپس لوٹے۔

ایئرپورٹ کا افتتاح: ایئرپورٹ اور سکول ایک ساتھ مکمل ہوئے۔ رن وے تو بن گیا تھا لیکن ٹرمینل بلڈنگ ہنوز نہ بن پائی تھی۔ میری شدید خواہش تھی کہ میرے ہوتے ہوئے پروازیں شروع ہو جائیں۔

میں نے سول ایوی ایشن اور پی آئی اے حکام سے بات کی تو انہوں نے صاف بتا دیا کہ جب تک ٹرمینل بلڈنگ نہیں بن جاتی فلائٹ نہیں آسکتی۔ کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے ایک درمیانی راستہ نکالا۔ چوہدری منیر نے تعمیر کے سلسلے میں جو سٹرکچر کھڑا کر رکھا تھا اس کو اکھاڑ کر لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اسے پی آئی اے اور سول ایوی ایشن کو Donate کر دیں۔ منیر مان گیا۔ اس طرح وقتی طور پر آٹھ دس کمرے انہیں مل گئے۔ ہم نے چندہ کر کے انہیں کچھ قالین اور کرسیاں میز خرید دیے۔ ضلع کونسل کی طرف سے ہنگامی بنیادوں پر پنجر شیڈ بھی تعمیر کروا دیا۔ ان دنوں بریگیڈیر اقبال نذیر وڑائچ پنجاب میں سول ایوی ایشن کا انچارج تعینات ہوا تھا۔ نہایت عمدہ اور نفیس انسان تھا۔ اس نے ہر طرح سے تعاون کیا۔

جب پی آئی اے کی پہلی فلائٹ نئے رن وے پر اُتری تو شہر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ایئرپورٹ پر پہنچ گئے۔ لوگوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ فلائٹ فل ہو کر گئی اس سے پہلے چھوٹی سی Ceremoney ہوئی۔ میں نے بطور چیف گیسٹ عمارت کا افتتاح کیا اور مختصر سی تقریر میں اس جدوجہد کا ذکر کیا جو ہم نے ایئرپورٹ کی تعمیر کے سلسلے میں کی تھی۔ لامحالہ کچھ تعریفی الفاظ وزیراعلیٰ میاں نواز شریف کی نذر بھی کیے گئے۔ جب دوسرے دن یہ خبر اخبار میں چھپی تو محترمہ بے نظیر اسے ہضم نہ کر سکیں۔ ان دنوں پنجاب اور مرکز میں چپقلش اپنے عروج پر تھی۔ پھر شیخ زید کے معاملے میں وہ بہت حساس تھیں۔ وہ کسی طرح نہ چاہتی تھیں کہ میاں صاحب کے نمبر بنیں یا ان کا قد کاٹھ بلند ہو۔ چنانچہ جس طرح نکاح کے اُوپر نکاح ہوتا ہے اسی طرح افتتاح کے بعد افتتاح کا پروگرام تھا اور اس سلسلے میں ریلوے منسٹر یوسف رضا گیلانی کی ڈیوٹی لگائی گئی۔ یوسف رضا گیلانی کا فون آیا کہ افتتاح کے سلسلے میں آنا چاہتا ہے اور اسے کینال ریسٹ ہاؤس میں کمرہ چاہیے۔ میں نے اسے بتایا کہ میاں نواز شریف کا حکم ہے کہ تمہیں ضلع میں نہیں گھسنے دینا تم اُلٹا کمرہ مانگتے ہو۔ ویسے بھی یہ بتاؤ کہ اس افتتاح کا کوئی قانونی یا اخلاقی جواز ہے۔ بولا ”حکم حاکم مرگ مفاجات ہوتا ہے۔ مجھے ہر صورت میں آنا ہے چاہے تم گرفتار ہی کیوں نہ کر لو۔ یوسف رضا احمد محمود کا پھوپھی زاد ہے۔ جو نیچو گروپ میں تھا بعد میں موقع پا کر پیپلز پارٹی میں شامل ہو گیا۔ میں نے اُسے گرفتار کیا کرنا تھا۔ ایک دن چپکے سے آیا اور سچا جھوٹا افتتاح کر کے اگلی گاڑی سے واپس چلا گیا۔ درحقیقت اُسے ریسٹ ہاؤس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی۔ ایک بہت بڑا سیلون ملا ہوا تھا۔

شیخ زید پبلک سکول: سکول بنانے کی اڑچنیں ایئرپورٹ کی تعمیر سے مختلف تھیں - وہاں اگر سول ایوی ایشن نے مخالفت کا بیڑہ اُٹھایا ہوا تھا تو یہاں محکمہ انہار مخاصمت پر اُتر آیا۔ انگریز کے زمانے میں کالونی اضلاع میں جب انہار کالونیاں بنیں تو ہر مکان کے ساتھ کھلی اراضی بھی رکھی گئی۔ کاغذوں میں تو یہ سرکاری زمین تھی اور مکانات کا حصہ نہ تھی لیکن عملاً اس پر محکمہ کے افسروں کا قبضہ تھا۔ وہی اسے کاشت کرتے، فصل اُگاتے اور اُٹھاتے۔ اسے گرین انکم کہا جاتا تھا۔ گو یہ فعل قانوناً جرم تھا لیکن ایک طویل عرصہ سے چشم پوشی سے کام لیا جا رہا تھا۔ کینال ریسٹ ہاؤس کے بالمقابل پچاس کنال اراضی کا ٹکڑہ پڑا تھا جس پر سپرنٹنڈنگ انجینئر چارہ وغیرہ اُگاتا تھا۔ وہ زمین سکول کے لئے مختص کی اور وزیراعلیٰ کی منظوری کے بعد اسکول کے نام انتقال ہوا تو ساری کالونی میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ S.E.Irrigation نے بہت بھاگ دوڑ کی لیکن ناکام رہا۔ جب سکول کی عمارت بن رہی تھی تو ہمیں احساس ہوا کہ خوبصورت ترین عمارت تو بن جائے گی لیکن کھیل کے میدانوں کے لئے مزید اراضی چاہئے۔ سینئر سیکشن کے لئے تو شہر سے باہر ماؤ مبارک روڈ پر چار مربع اراضی ریزرو کر دی لیکن جونیئر سکول کے لئے عمارت سے ملحقہ اراضی چاہئے تھی۔ چنانچہ SE کے مکان سے ملحقہ زمین بھی ہم نے کاغذوں میں اپنے نام کر لی - اس پر سارے پنجاب میں ہلچل مچ گئی اور واویلا شروع ہو گیا۔ میں نے ایس ای کو بلا کر کہا کہ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ بولا: آپ مجھے بے گھر کرنا چاہتے ہیں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ۹۰٪ اراضی پر اس کا ناجائز قبضہ ہے تو اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے 409 تعزیرات پاکستان پڑھ کر سنائی تو وہ کانپنے لگا۔ صرف ایک لفظ اس کے منہ سے بار بار نکل رہا تھا کہ آپ ظلم کر رہے ہیں۔ میں نے اسے دو آپشن دیئے۔ ایک تو یہ کہ اسے چھ کنال اراضی پر اس کی حسب خواہش نیا مکان تعمیر کروا دیتا ہوں اور دوسرا یہ کہ وہ اگر چاہے تو ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں شفٹ ہو جائے۔ نو تعمیر شدہ مکان میں ڈی سی ہاؤس منتقل ہو جائے گا۔ وہ ایک گہرے شک کی نگاہ ڈالتے ہوئے بولا "کل آپ تبدیل ہو گئے اور نئے ڈی سی نے آ کر مجھے زبردستی نکال دیا تو پھر کیا ہوگا۔" کافی ردو قدح اور بحث و تمحیص کے بعد محکمہ اس بات پر راضی ہوا کہ مکان کی چاردیواری کے باہر جس قدر اراضی ہے وہ سکول کی ملکیت تصور ہوگی۔

سکول کی عمارت مکمل ہوئی تو نئے پرنسپل کی تلاش شروع ہوئی۔ سکول کا نام شیخ زید پبلک سکول رکھا گیا۔ مجھے پتہ چلا کہ برن ہال کے سابق پرنسپل بریگیڈیئر صدیقی

صاحب آج کل فارغ بیٹھے ہیں اور صرف اخباروں میں آرٹیکل لکھتے ہیں۔ میں نے کسی دوست کی معرفت ان سے رابطہ کیا اور انہیں منہ مانگی تنخواہ دینے کا عندیہ دیا۔ دراصل اس قدر دُور دراز علاقے میں کوئی شخص نوکری کے لئے تیار نہ ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے آرمی ایجوکیشن کا ایک کرنل جعفری ہتھے چڑھا اور اس طرح ہم نے سکول میں اُستاد اور استانیاں بھرتی کر کے کلاسوں کی ابتدا کی۔ ان دنوں سارے شہر میں آرمی کا ایک انگلش میڈیم سکول تھا، جب بریگیڈیئر منصور حامد نے سکول کی سج دھج اور اہل شہر کا اس کی طرف رجوع دیکھا تو اس کی رالیں ٹپکنے لگیں۔ ایک دن میرے پاس آیا اور کہنے لگا شاہ صاحب! کیوں نہ ہم ان دو سکولوں کا الحاق کر لیں۔ میں نے یہ کہہ کر کہ آگ اور پانی کا بھی کبھی الحاق ہوا ہے؟ ہنس کر ٹال دیا۔

Who is Nawaz Sharif?

میاں نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو میں جو سیاسی رسہ کشی اور کھینچا تانی شروع ہوئی تھی وہ بتدریج بڑھتی گئی اور اس کے اثرات ضلع کی سطح تک بھی ظاہر ہونے لگے۔ یہ اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئی جب شیخ زید کے جہاز نے نئے ایئرپورٹ پر اُترنا تھا۔ میاں صاحب نے مجھے بلا کر دو باتیں کیں۔ ایک تو یہ کہ شیخ کا استقبال ضلعی انتظامیہ اور صوبائی حکومت نے کرنا ہے اور مرکز کے نمائندے کو اس کے نزدیک بھی نہیں پھٹکنے دینا اور دوسرا وہ سرور بن محمد کو ملنا چاہتے ہیں اس کا بندوبست بھی ہر صورت کرنا ہوگا۔

پہلے حکم کی تعمیل تو اتنا مشکل کام نہ تھا البتہ دوسرے میں خاصی دشواری پیش آئی۔ شیخ زید کا عملہ میاں نواز شریف سے خدا واسطے کا بیر رکھتا تھا۔ جب میں نے ظفر اقبال کو کہا کہ میاں صاحب شیخ زید کے داماد سرور بن محمد کو ملنا چاہتے ہیں تو وہ طنزاً بولا Who is? Nawaz Sharif میں فوراً بھانپ گیا کہ یہاں دال گلتی ہوئی نظر نہیں آ رہی۔ پھر بھی جواباً کہا میری مراد وزیر اعلیٰ پنجاب ہے۔ کہنے لگا ”ایسے کئی وزراء اعلیٰ شیخ زید کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ اس نے ضرور ابوظہبی میں کارخانہ لگانا ہوگا۔“

چند دن بعد جب میاں صاحب نے پراگریس پوچھی تو مجھے جواب دینے میں خاصی دقت محسوس ہوئی۔ صرف اتنا کہا کہ سر! تھوڑی سی اڑچن ہے، انشاء اللہ دُور ہو جائے گی۔ شاہ صاحب! آپ کے ہوتے ہوئے کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔ یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ جو لوگ Semantics & Naunces سے واقف ہیں انہیں بخوبی علم ہے کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلے ”شاہ باوے! بوریا بستر بن لے“ میں نے چوہدری منیر سے بات کی

انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے مشورہ دیا کہ ظفر کو میں بلوچستان پر لکھی ہوئی اپنی کتاب پیش کروں۔ ایک تو وہ ادبی ذوق رکھتا ہے دوسرا شیخ زید کی دلچسپی بھی اس صوبے میں دن بدن بڑھ رہی ہے۔ چوہدری منیر کا مشورہ نہ تھا بلکہ نسخہ کیمیا تھا۔ ظفر اقبال نے ''اجنبی اپنے دیس میں'' پڑھ کر ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ ہنس کو بولا ''اس قدر خوبصورت کتاب کیسے لکھ ڈالی۔ یقین کرو میں نے دو نشست میں اسے ختم کیا ہے۔'' جونہی اس نے بات ختم کی میں نے آسٹریلیا پر لکھی ہوئی کتاب ''سلگتے ساحل'' پیش کر دی۔

جس طرح سورج کی کرنیں برف کو پگھلا دیتی ہیں اسی طرح ان دو کتابوں نے مغائرت کی دھند کو صاف کر دیا۔ جب میاں صاحب کا تیسری مرتبہ فون آیا تو میں نے دوسری بار ظفر اقبال سے درخواست کی۔ ہنس کر کہنے لگا ''شاہ صاحب آپ ڈی سی رحیم یار خان نہیں بلکہ ظفر اقبال کے دوست ہیں۔ اگر میاں نواز شریف کو ملنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر سرور بن محمد سے کیا ملنا ان کی ملاقات شیخ زید سے کروا دیتے ہیں اور اس کے لئے ہز ہائی نس کی طرف سے انہیں باضابطہ دعوت دی جائے گی۔ جب میں نے فون پر میاں صاحب کو وہ 'مژدہ جانفزا' سنایا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ہنس کر بولے:

I knew that you will never fail me.

انتظامی افسر اپنی ساری سروس انہی امتحانات میں گزارتا ہے اور شومئی قسمت سے پاس فیل ہوتا رہتا ہے۔ حاکمانِ وقت جن میں ممبران اسمبلی بھی شامل ہیں کے مطالبے بسا اوقات اس قدر زچ کر دینے والے ہوتے ہیں کہ جی چاہتا ہے آدمی نوکری چھوڑ کر سادھو بن جائے اور عمر کا بقیہ حصہ جنگلوں میں گزار دے۔ ایک کامیاب افسر وہ ہوتا ہے جسے کام نہ کرنے کا بھی گر آتا ہو **How not to do a thing**

اگر آپ کسی شخص کے منہ پر فوراً ناں کر دیں گے یا اسے جھاڑ پلا دیں گے تو پھر فیلڈ میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتے۔ کام نہ بھی کرنا ہو یا ناجائز ہو تو کہیں ''دیکھوں گا، سوچوں گا، سمجھوں گا'' ایک تاریخ دے دیں۔ جائز ہے تو کر دیں، ناجائز ہے تو ہرگز نہ کریں۔ اکثر صورتوں میں سفارش کرنے والا وقتی ضرورتوں کے تحت دباؤ ڈالتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مطالبے کی شدت میں کمی آتی جاتی ہے۔ ہمارے ایک سابقہ ڈپٹی کمشنر صاحب نے اپنی ڈائری میں دو سفارشی رقعوں کا ذکر کیا ہے جو دو وزراء نے انہیں اپنے اپنے حق میں فیصلہ کرنے کے لئے بھیجے تھے۔ سائیلان نے وہ رقعے عین اس وقت دیے جب وہ عدالت میں مقدمہ سن رہے تھے۔ پہلے تو انہیں وہ رقعے لینے ہی نہیں چاہئیں تھے۔ پھر بھری عدالت میں انہیں پڑھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ بالفرض

کھول ہی بیٹھے تھے تو انہیں مثل کے ساتھ لگانے کی کیا تک تھی۔ قانونی تقاضے پورے کیے جاتے اور وزراء کو توہین عدالت کا نوٹس دیا جاتا۔ انور زاہد صاحب کمشنر تھے اور میں ان دنوں سیکرٹری آر ٹی اے تھا۔ میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک شخص کسی وزیر کا سفارشی رقعہ لایا۔ اسے کوئی لائسنس چاہئے تھے۔ چونکہ وہ دفتر میں بیٹھے تھے اس لئے بڑے اطمینان سے انہوں نے رقعہ پڑھا۔ سائل کو بڑے نرم اور دھیمے لہجے میں اس پر غور کرنے کا عندیہ دیا۔ جب وہ شخص باہر گیا تو انہوں نے میری موجودگی میں رقعہ پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ اگر چاہتے تو اسے ڈانٹ ڈپٹ کر باہر بھی نکال سکتے تھے۔ جن لوگوں نے وزیروں کو کام کرتے دیکھا ہے انہیں علم ہے کہ اکثر سفارشی رقعوں پر دستخط کرتے ہوئے انہیں نہ تو کام کی نوعیت کا پتہ ہوتا ہے اور نہ پوری طرح نفس مضمون جانتے ہیں۔ ''ہجوم عاشقاں'' میں ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی درخواست پر پہلے ''گھوگی'' پھیری جائے۔

بظاہر میاں صاحب کی فرمائش بڑی معصوم سی تھی۔ حقیقتاً کسی بھی انتظامی افسر کی صلاحیتوں کے لئے وہ ایک چیلنج بھی تھا۔ آج بھی میں جب ان واقعات پر غور کرتا ہوں تو بڑا حظ اٹھاتا ہوں۔ طے یہ پایا کہ شیخ زید رحیم یار خان پہنچ کر میاں نواز شریف کو لنچ کی دعوت دیں گے۔ لنچ سے پہلے One on One ملاقات ہوگی۔ اس کے بعد دونوں لیڈر ایک کار میں بیٹھ کر شہریوں کی طرف سے دئے گئے عصرانے میں شرکت کریں گے اور خطاب بھی فرمائیں گے۔ محل سے لے کر میونسپل کمیٹی تک کا راستہ جھنڈیوں، پاکستان اور ابوظہبی کے پرچموں، نمائشی دروازوں اور محرابوں سے سجایا جائے گا۔ راستے میں لوگ زندہ باد کے نعرے لگائیں گے جگہ جگہ جھومر پارٹیاں رقص پیش کریں گی۔ شیخ زید کو یہ باور کرانا ضروری تھا کہ میاں صاحب ملک کے مقبول لیڈر ہیں اور بے نظیر کی مقبولیت کا گراف تیزی سے نیچے آ رہا ہے۔

جب محترمہ کو اس پروگرام کا پتہ چلا تو وہ بڑی جز بز ہوئیں۔ انہوں نے ڈائریکٹر جنرل پراٹوکول کے ہاتھوں پیغام بھجوایا کہ پراٹوکول کے تحت ایک ہیڈ آف دی سٹیٹ کسی صوبائی وزیر اعلیٰ کے ساتھ Drive in state نہیں کر سکتا۔ اس پیغام کا ہز ہائی نس نے مدلل جواب بھیجا۔ انہوں نے لکھا کہ ایسا State visit میں ہوتا ہے۔ یہ ان کا نجی دورہ ہے اور وہ Commitment کر چکے ہیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب دیرینہ تعلقات کو سخت دھچکا لگا اور بتدریج سرد مہری بڑھتی گئی۔ نواز شریف نے شیخ زید کو مری میں محل بنانے کے لئے زمین کی پیشکش کی تو مرکزی حکومت نے اس ڈیل کے خلاف بڑا زہریلا پروپیگنڈا کیا اور نتیجتاً ہز ہائی نس نے

زمین خریدنے سے انکار کر دیا اور اس طرح مری کے لوگ ایک بہت بڑی سہولت سے محروم ہو گئے۔ معاہدے کی رو سے شیخ زید کو اپنے خرچ پر دریائے جہلم سے مری تک Lift Irrigation کے ذریعے عوام کے لئے پانی لانا تھا۔

ڈی جی پراٹوکول کو تو ہم نے آڑے ہاتھوں لیا۔ مرکزی حکومت نے شیخ زید کے استقبال کے لئے وزیر بھیجے۔ صوبائی حکومت کی طرف سے احمد محمود کو یہ فرض سونپا گیا کہ وہ سب سے پہلے معزز مہمان کو ملے گا۔ ہار پہنائے گا اور میاں نواز شریف کی طرف سے نیک خواہشات کا اظہار کرے گا۔ یہ اس وقت ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کا وزیر تھا۔ اس نے جب ایئرپورٹ پر کشمکش اور چپقلش دیکھی تو ہتھیار پھینک دیئے۔ بے بسی سے کندھے اُچکاتے ہوئے بولا مجھ سے یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے دھکے لگیں۔

میں نے کہا ''تم وزیر ہو۔ وزیر اعلیٰ ناراض ہو جائے گا۔''

کہنے لگا ''آپ مجھے سیاست میں لائے ہیں۔ وزیر بنوایا ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ نوبت نہیں آنے دیں گے'' وزیر بننے کے باوجود ہنوز اس کا بچگانہ ذہن تھا۔ میں نے ہار پہنانے کا فرض میاں عبدالخالق کو سونپ دیا۔ جب جہاز لینڈ کرنے لگا تو ڈی جی پراٹوکول نے سب کو لائین میں کھڑا ہونے کو کہا۔ ہر کوئی حسب مراتب کھڑا ہو گیا۔ میری طرف دیکھ کر تحکمانہ لہجے میں بولا ''تم نہیں کھڑے ہوئے؟''

میں نے کہا ''یہی سوال تم سے پوچھا جا سکتا ہے۔''

کہنے لگا ''I am master of the ceremonies''

میں نے کہا ''I am the ultimate authority in the district''

حیرت زدہ لہجے میں بولا ''کیا تم نے پراٹوکول کی کتاب پڑھی ہے''

''وہ اسلام آباد میں پڑھی جاتی ہے۔ یہاں کی صورت حال مختلف ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔'' اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کس سے مدد طلب کرتا۔ پولیس تو ساری میرے ماتحت تھی۔ حکم وزیر اعلیٰ کا تھا اور کھڑا وہ رحیم یار خان میں تھا۔ قصہ مختصر میاں عبدالخالق نے ہار پہنایا۔ میں نے استقبالیہ پارٹی کا ہز ہائی نس سے تعارف کرایا۔ جب احمد محمود کا تعارف کرایا تو وہ فٹ سے بولا جناب میرے پاس Spotted dear ہیں۔ اگر پسند فرمائیں تو آپ کے وائلڈ لائف پارک کے لئے چند جوڑے بھجواؤں؟ شیخ زید نے مسکرا کر ہاں کر دی۔ جمال دین والی میں مخدوم غلام میراں شاہ نے ہرنوں کی افزائش نسل کا خصوصی انتظام کر رکھا تھا اور وقتاً فوقتاً بڑے آدمیوں کو تحفتاً جوڑے بھیجتا تھا۔ ہر تحفے کی اپنی ایک اہمیت اور نوعیت ہوتی ہے۔ بازار میں بکتی ہوئی مہنگی سے مہنگی چیز تو خریدی جا سکتی ہے لیکن اس

قسم کے نادر اور نایاب تحفے آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ ہرن، مور، تلور، کالے تیتر، خاص طور پر بولتے بھی ہوں۔ کالے تیتروں کی بڑی مانگ ہے۔ ایک تاثر عام ہے کہ جس گھر میں کالا تیتر ہو وہاں کالا چھوڑ پیلا جادو بھی اثر نہیں کرتا۔ عوام کی اکثریت اب بھی ٹونے ٹوٹکوں کے زیر اثر ہے۔ دراصل جہاں غربت اور جہالت یکجا ہو جائیں وہاں اس قسم کی ''افیون'' بڑی کارآمد ہوتی ہے۔

ہرنوں کی منتقلی ایک مسئلہ بن گئی۔ عام ہرن کی نسبت چترا ہرن بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کی جلد نرم ملائم اور ریشمی ہوتی ہے۔ طبعاً بڑا ڈرپوک جانور ہے۔ جب تجرباتی طور پر ایک جوڑے کو ٹرک میں ڈالا گیا تو نر اور مادہ کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ یہ نایاب جنس نقل مکانی پسند نہیں کرتی۔ لاہور سے بے ہوش کرنے والی گن منگوائی گئی تو بڑی مشکل اور وقت سے چند جوڑے منتقل ہو سکے۔ جس طرح ہر وی آئی پی کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی سفر کرتا ہے ان کے ساتھ بھی ویٹرنری ڈاکٹر گیا۔ جس کا کام یہ تھا کہ اختلاج قلب کی صورت میں وہ حتی الوسع انہیں پرلوک سدھارنے نہیں دے گا۔

میاں صاحب کی ملاقات کی تاریخ طے پا گئی تو ہمیں احساس ہوا کہ ایک بہت بڑا بوجھ سر پہ آن پڑا ہے۔ ان کا ارشاد گرامی تھا کہ محل سے لے کر میونسپل لان تک تمام راستہ دلہن کی طرح سجا ہونا چاہئے۔ سینکڑوں کی تعداد میں محرابیں اور دروازے لگنے چاہئیں۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو اکٹھا کرنا ہے اور سارے ضلع کی جھومر پارٹیاں بھڑکیلے ریشمی لباس پہنے رقص کرتی نظر آئیں۔ اگر ایک نعرہ شیخ زندہ باد لگے تو دوسرے میں میاں صاحب کا نام آنا چاہئے۔ ڈانسنگ ہارسز اور کیمل بھی جتنے دستیاب ہوں لائے جائیں۔ اس کام کے لئے کوئی فنڈ مہیا نہ کیے گئے۔ سب کام ہمیں اپنی مدد آپ کے تحت کرنا تھا۔ یہ پٹواری لوگ ہی ہیں جو ایسے موقعوں پر اپنی مدد بھی کرتے ہیں اور حکومت کے معاون بھی ثابت ہوتے ہیں۔

وزیراعلیٰ کے دورے کے لئے عموماً ایک پجیرو گاڑی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بڑے گھر جانے کے لئے وہ موزوں نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ اُونٹ والوں سے یاری ہو تو دروازے اُونچے رکھنے پڑتے ہیں۔ اسی طرح نوابوں سے میل ملاپ کے لئے وہی طور طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔ ہم نے رولز رائیس کی تلاش کی لیکن بدقسمتی سے دستیاب نہ ہوئی۔ نواب بہاولپور کی چند پرانی گاڑیاں تھیں لیکن وہ بھی کھڑے کھڑے بے کار ہو گئی تھیں۔ اپنا رنگ روپ کھو بیٹھی تھیں اور چالو حالت میں نہ تھیں۔ چوہدری منیر کی مدد سے ہم نے مرسڈیز ۵۰۰ کا بندوبست کیا۔

[جاری ہے۔]

ابو جی [خاکہ]

والد گرامی کے متعلق لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ایک طرف رشتے کا تقدس، دوسری طرف مزاح کی ذمہ داری، لیکن کوئی بات نہیں ہم شروع سے خاردار راہ پر چلنے کی عادی ہیں۔ اس لیے قلم اٹھا کر دیکھتے ہیں۔

جب ہم نے سوچا ابو جان کا ایک خاکہ لکھنا چاہیے کیونکہ ان کی طبیعت اور ذات میں متعدد ایسے پہلو تھے کہ جن کو یاد کر کے دل خوش ہوتا ہے لیکن جب قلم کو یہ ذمہ داری سونپی تو ذہن کو ماؤف پایا۔ ان کی تمام زندگی سامنے ہونے کے باوجود کوئی بات یاد نہیں آ رہی تھی جس پر قلم کو جنبش دی جائے۔

ہم نے جب بھی ان کو دیکھا شلوار اور بنیان میں ہی پایا۔ دھوتی وہ نہیں پہنتے تھے مگر گھر میں قمیض پہننے کی زحمت بھی نہیں کرتے تھے۔ جب گھر سے باہر جاتے اس وقت قمیض پہنی جاتی، ورنہ ''بنیان زندہ باد''۔ بنیان اکثر اوپر ہو جاتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ نے بنیان نہیں بلکہ انگیہ کرتی پہن رکھی ہے۔ اکثر خواتین ہمارے گھر تشریف لاتیں تو والد صاحب کو دیکھ کر دنگ رہ جاتیں کہ کہیں ان کی آنکھوں کو دھوکہ تو نہیں ہو رہا، کیا داڑھی والی خاتون بھی ہوتی ہے۔

ابو جی پکے مسلمان تھے۔ پانچ وقت کے نمازی، روزہ کے پابند اور کثرت سے درود شریف بھی پڑھتے تھے۔ چہرہ داڑھی میں سجا ہوا، ان کا گورا رنگ خوب لشکارے مارتا تھا۔ لوگ ان کو اکثر پٹھان سمجھتے تھے۔ جب بھی گھر موجود ہوتے تو مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے تشریف لے جاتے اور ہمیں بھی ساتھ لے جاتے۔ باقی نمازوں کی تو خیر تھی لیکن فجر کی نماز کے وقت جب ہم سنہرے خواب دیکھ رہے ہوتے وہ ہم کو جگا دیتے اور نماز پر ساتھ لے جاتے۔ سردیوں میں جب وہ یہ عمل دہراتے تو والد کم اور ہماری نیند کے دشمن زیادہ لگتے۔ فجر کی نماز پر ان کا اٹھانے کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے نام لے کر پکارتے اور ساتھ کہتے اٹھو نماز کو دیر ہو رہی ہے۔ تین، چار دفعہ یہ عمل کرنے کے بعد اگر ہم ٹس سے مس نہ ہوتے تو سردیوں میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر اٹھایا کرتے اور نماز پر لے جاتے۔ بچپن میں تو اس عمل کی خیریت تھی لیکن جوانی کے سہانے خواب سے ان کا اٹھانا ہماری طبیعت پر

محمد کلیم

بہت گراں گزرتا تھا۔ لیکن ان کے سامنے دم مارنا ہمارے بس سے باہر تھا۔ اس لیے آداب فرزندگی کے مارے ان کے پیچھے پیچھے مسجد کی راہ لیتے اور دل میں ان کو کوستے جاتے، پر زبان پر اُف نہ لاتے۔

ہم نے تمام عمر ان کے منہ سے ناشکری کے الفاظ نہ سنے۔ اللہ نے جس حال میں رکھا، وہ اس پر خوش اور مسکراتے رہے۔ ایک بار ہمارے بھائی سے بالکل نئی موٹر سائیکل چوری ہوگئی۔ حالات بھی اچھے نہیں تھے لیکن آپ نے اس کو اُف تک نہ کہا بلکہ کہنے لگے میں دوبارہ نئی موٹر سائیکل لے دوں گا اور چوری ہونے میں تمہارا کیا قصور، اس لیے پریشان مت ہو اور کچھ دن بعد آپ نے اس کو نئی موٹر سائیکل خرید کر دی اور تلقین کی اب ذرا پہلے سے زیادہ احتیاط کیا کرے۔

آپ غصہ کے تیز تھے لیکن آپ کا غصہ آتا تھا اور چلا جاتا تھا۔ اکثر ان کو یاد بھی نہیں رہتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے کس بات پر اور کس سے غصہ کر رہے تھے۔ لیکن جب اُن کو غصہ آیا ہوتا تو کوئی بچہ بھی اُن کے قریب نہ جاتا کیونکہ نجانے غصہ میں کون سی شے اُن کے ہاتھ لگے اور وہ دے ماریں۔ لیکن ابو جی کے نشانے بڑے کمزور تھے، یا وہ جان بوجھ کر اِدھر اُدھر اچھال دیتے تھے۔ ہم کو معلوم نہیں لیکن ان کو غصہ میں صرف والدہ ماجدہ ہی قابو کر سکتی تھیں، باقی سب ان سے دور بھاگتے تھے اور اپنے اپنے کونوں میں پناہ لیتے تھے۔

والد صاحب شوگر کے مریض تھے لیکن میٹھے کے دیوانے تھے۔ وہ اس مقولے پر یقین رکھتے تھے کہ ''لوہے کو لوہا کاٹتا ہے''۔ اس لیے شوگر کو میٹھے سے ختم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ان کو ہر وہ شے پسند تھی جس میں میٹھا ہو مثلاً دودھ جلیبی، دیسی گھی شکر، آم، آملہ، خمیرہ گاؤزبان وغیرہ وغیرہ۔ ہفتے میں تین دن وہ ضرور دودھ جلیبی کھاتے تھے تاکہ طاقت بحال رہے۔ باقی دن دیسی گھی اور شکر سے گزارہ کرتے تھے۔ آموں کے موسم میں تین وقت آم کی خوراک استعمال کرتے تھے۔ آم کے ساتھ ملائی اُن کی پسندیدہ خوراک تھی۔ ایک کیمرہ مین کم حکیم صاحب آپ کو مل گئے، انہوں نے آپ کے لیے مربہ جات بنائے۔ آپ نے کھائے کہ آپ کی شوگر گلوکومیٹر پر error بن جاتی یعنی اتنی زیادہ ہوتی کہ مشین اس کو ماپنے سے انکار کر دیتی۔ ان مربہ جات کے بعد آپ کی طبیعت سنبھلی نہیں بلکہ بد سے بد تر ہوتی چلی گئی۔

آپ کو انگریزی لباس سے نفرت تھی اس لیے پینٹ کو ''چوت کسی'' کہتے تھے اور اس کو پسند نہیں کرتے تھے، خاص طور پر آپ کو

جینز ذرا نہیں بھاتی تھی۔ ان کا خیال تھا مرد کی شان داڑھی مونچھوں میں ہے، ''مچھ نئیں تے کچھ نئیں''۔ جب ہم نے داڑھی مونچھ سے جان چھڑائی ہم کو تو وہ فالتو شے معلوم ہوئی۔ وہ ہم سے بہت شدید ناراض ہوئے اور کہا کہ کم از کم مونچھیں رکھو لیکن ہم ان کے سامنے خاموش رہے لیکن کلین شیو برقرار رکھی تو انہوں نے ہم کو ٹوکا نہیں۔

ان کی حسِ مزاح خوب تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج ہم طنز و مزاح لکھ رہے ہیں۔ وہ جب بھی کسی پر طنز یا مذاق کرتے تو خود نہیں ہنستے بلکہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے کہ پکا منہ کر کے کتنی دلچسپ بات کر رہے۔ ان کی اس عادت کی وجہ سے کچھ لوگ آپ سے دور بھی رہتے تھے کہ آپ کو طنز کے نشتر چلانے کی عادت ہے کہیں وہ نہ اس کا نشانہ بن جائیں۔

ابو جی شوگر سے لڑتے رہے۔ وہ 25 سال اس مرض میں مبتلا رہے اور ڈٹ کر بیٹھا کھایا۔ آخر کمزور بدن نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ پہلے شوگر نے آنکھوں پر حملہ کیا، پاؤں پر حملہ کیا اور آخر گردوں کو بیکار کیا۔ کہتے ہیں گردے ایک بار خراب ہو جائیں تو ٹھیک نہیں ہوتے۔ یہی ان کے ساتھ ہوا۔ ہم نے کوشش کی کہ گردہ تبدیل کرایا جائے لیکن شوگر نے ان کے جسم کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ وہ اتنے بڑے آپریشن کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اس کا risk نہ لیا جائے۔ وفات سے پہلے وہ پندرہ دن کے لیے قومہ میں چلے گئے۔ جب ان کا electrolytes بیلنس خراب ہوا۔ اس دور میں وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ باتیں کرتے کرتے سو جاتے، نماز پڑھتے بھول جاتے۔ ان کو اکثر باتیں بھول گئی تھیں۔ وہ دن میں بیس بیس بار نماز کا ارادہ باندھتے اور بھول کر بے ہوشی میں چلے جاتے۔ جب وہ قومہ سے اٹھے تو انہوں نے طے کیا کہ اب وہ نئی زندگی گزاریں گے، بالکل بدپرہیزی نہیں کریں گے اور باقاعدگی سے ورزش یعنی چہل قدمی کیا کریں گے۔ اس سے پہلے جب بھی ہم نے ان سے ورزش کرنے کا کہا تو یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ ہمارے بڑوں نے کبھی ورزش نہیں کی ہم کیوں کریں۔ لیکن وہ بھول جاتے تھے ان کے بڑوں کو گاڑی، موٹر سائیکل کی سہولت حاصل نہیں تھی، وہ پیدل چلا کرتے تھے۔ لیکن وقت گزر چکا تھا اور بیماری نے ان کے تمام اعضائے رئیسہ کو زنگ لگا دیا تھا۔ آپ قومہ کے بعد صرف پندرہ دن زندہ رہے۔ وقتِ رخصت آپ کی زبان پر کلمہ حق جاری تھا اور وہ رب کا شکر پڑھتے جا رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

وہ نئے گلے وہ سماعتیں!!!! (مزاح)

جی ہاں! میں سننے والی ''کان'' ہی کی بات کر رہا۔

''کان'' انسانی جسم کا وہ عضو ہے جسے بدقسمتی سے کبھی بھی اپنا جائز مقام واحترام نہیں ملا۔ ہمارے شعرا حضرات نے اپنی شاعری میں یوں تو تقریباً تمام اعضائے بدن کا احاطہ کرلیا، ہر عضو بدن تک پہنچے؛

میں کہاں کہاں نہ پہنچا تیری دید کے لگن میں!!!

کے بمثل صفحوں کے صفحے رنگ دیئے توصیف و مدح میں، مگر وہ ''کان'' تک یا تو پہنچ ہی نہیں پائے یا انہوں نے جان بوجھ کر ''کان'' سے چشم پوشی اختیار کرلی۔

سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

.....

سرو نما قد، نرگسی آنکھوں، پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں، صراحی گردن، ناگن زلفوں اور قاتل ابروؤں کا ذکر تو بکثرت آیا ہماری شاعری میں؛ نہیں آیا تو فقط کانوں کا ذکر نہیں آیا۔ علاوہ ازیں ہمارے یاں ''کان'' کا استعمال جب بھی کیا گیا، برے مقاصد کے لئے اور بری نیت سے ہی کیا گیا؛ بقول شاعر:

جس نے ڈالی بری نظر ڈالی!!!

'' آہستہ بول؛ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں'' اور'' لگتا ہے میری نصیحت سے تمہارے کانوں پہ جوں تک نہیں رینگی'' جیسے جملے کان کی توصیف میں تو ہو ہی ہیں سکتے۔ اسی طرح'' کان کھجانا تو شرمندگی و ندامت کی علامت ہوسکتی ہے، کان کی مدح نہیں۔ شاعروں کے برعکس البتہ ہمارے لسانیات کے ماہروں نے انصاف سے کام لیا اور کان کے عنوان سے فیروز اللغات جیسے ضخیم لغت میں دو صفحے کے محاورات بنا ڈالے۔ مگر شاعروں سے گلہ بہرحال بنتا تو ہے!! ۔

چند دہائیاں پہلے تک جب سکول و مدرسے میں سزا کا عام چلن ہوا کرتا تھا، بدقسمت ''کان'' سزا کا لازمی جز ہوا کرتا تھا۔ ہر قسم کی سزا میں ''کان'' کو بھی ضرور گھسیٹا جاتا تھا، گویا؛

نور کمال شاہ

تیرے نام سے شروع تیرے نام پہ ختم !!!
والا معاملہ روا رکھا جاتا تھا - گوشمالی جیسی اصطلاح انہی دنوں ایجاد ہوئی - استاد مکرم بچے کو کان سے پکڑ کر کھڑا کرتے اور ڈنڈے سے اس کی کھال ادھیڑ دیتے - بعینہ اسی طرح مرغا بنانا اس دور میں اساتذہ کرام کی مرغوب سزا تھی - اس قسم کی سزا میں بچہ بیٹھ کر اپنی ٹانگوں کے بیچ میں سے دونوں ہاتھ گذار کر کان پکڑ لیتا تھا - پتہ نہیں مرغا بننا کس کی تخلیق کردہ سزا تھی مگر تھی بہت سخت اور شرمندہ کرانے والی - بچے کی ہیئت کذائی اور ہیبت رسوائی دیکھ کر دیگر بچوں کے قہقہے چھوٹ جاتے تھے -

''کان'' ہماری جسم کا وہ انتہائی مفید حصہ ہے جس کی مدد سے سننے جیسی عظیم نعمت سے فیض یاب ہوا جا سکتا ہے - ''کان'' کی اہمیت کا حال ان سے پوچھیں جو سماعت کی صلاحیت سے محروم ہیں - یہ حقیقت تو اب میڈیکل کے شعبے سے وابستہ عام افراد بھی کھلم کھلا بیان کرتے رہتے ہیں کہ جو بندہ بشر سننے کی صلاحیت سے محروم رہتا ہے وہ ہمیشہ بولنے کی خوبی سے بھی ناآشنا ہی رہتا ہے - پس معلوم ہوا کہ بولنے کے لئے سننا ازحد ضروری ہے - اس سے ہماری نظروں میں کانوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے -

اپنی جغرافیائی اہمیت، ظاہری ساخت اور انوکھی ہیئت کے باعث ہمارے ستم ایجاد اہل کرم ''کان'' کو سماعت سے ہٹ کر دیگر مقاصد و مطالب کے لئے کھلم کھلا استعمال کرتے رہتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ نہ تو کبھی ہچکچاتے ہیں اور نہ ہی انہیں کبھی خدا خوفی لاحق ہوتی ہے -

دنیا کے عجائبات کی کان محض وہ ''کان'' نہیں جہاں سے قیمتی معدنیات نکالے جاتے ہوں بلکہ چہرے کے عقب میں دائیں بائیں دونوں طرف یکساں فاصلے پر نصب، بیضوی شکل کے اعضاء بھی ''کان'' کہلاتے ہیں اور یہ فوائد و کمالات میں اول الذکر کان سے کسی طور کم یا کمتر نہیں ہوتے - ''کان'' کا مقصد اولین تو باہر کی آوازوں کو منعکس کر کے سماعتوں تک پہنچا کر سننے کے قابل بنانا ہے تو دوسری جانب یہ ایک نہایت اہم اور مستقل سہارے کا کردار بھی ادا کرتے ہیں جہاں آپ عینک کے دستے ٹکا کر اور عدسوں کو آنکھوں کے سامنے لا کر دھندلے مناظر کو صاف اور واضح دیکھ سکتے ہیں (بشرطیکہ نیت بھی عینک کے شیشے کی طرح صاف ہو) - اگر خدانخواستہ انسان کے کان نہ ہوتے تو نہ جانے ہمارے موجدین عینک کو کیسے اور

کیوں کر آنکھوں کے سامنے جماتے اور وہ نیا انداز پتہ نہیں کتنا بھدا اور بے رونق لگتا، یہ سوچ کر ہی ہول آنے لگتا ہے - حالیہ کورونا وبا کے دنوں میں ہمارے محکمہ صحت کے کرم فرماؤں نے ماسک کے استعمال کے لئے بھی اسی طریقے کے استعمال کی راہ سجھائی - یہاں بھی پرچہ ترکیب استعمال تقریباً وہی رہا جو عینک کے لئے مقرر تھا، یعنی اس نازک گھڑی میں بھی ماسک کو منہ اور ناک کے اوپر لپیٹے رکھنے کے لئے کانوں کا ہی آسرا اور سہارا لینا پڑا - ماسک کی ڈوریاں دونوں جانب کانوں میں اٹکا کر منہ اور ناک ڈھانپ لی اور دھول مٹی سمیت جراثیم اور وائرسوں سے حفاظت یقینی بنالی - اس سے کم از کم ایک بات تو ثابت ہوگئی کہ کانوں کے مضبوط اور مستقل سہارے سے ہم نہ صرف آنکھوں کے سامنے عینک کے شیشے ٹکا سکتے ہیں بلکہ منہ و ناک کو بھی یہاں سے محفوظ بنایا جاسکتا ہے-

جنس وفاداری جگانے یا پیدا کرنے کے لئے (اگر معلوم ہو جائے کہ یہ قدرتاً پیدا ہے) کانوں کا استعمال زمانہ قدیم سے جاری ہے - اس کی ایک مثال بے زبان کتے ہیں - کتوں میں وفاداری کا جذبہ بیدار کرنے اور اسے نمک حلال بنانے کے لئے اس کے کان کاٹے جاتے ہیں - یہ تجربہ ابھی شائد تکمیل کے مرحلے تک نہیں پہنچا جبھی تو صرف حیوانات تک ہی محدود ہے - ممکن ہے کامیابی کے بعد اسے انسانوں کے لئے بھی استعمال کیا جاسکے، اور جذبہ وفاداری کے فروغ کے لئے ان کے کان بھی کترنا شروع ہو جائیں - ہاں البتہ نظر بد کو زائل کرنے اور اس کے برے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے کانوں میں چھید کرنے کی روایت ہم انسانوں میں پہلے سے موجود ہے - نظر بد سے اپنے نرینہ اولاد کی بہتر حفاظت کی خاطر ہم ان کے کانوں میں سوراخ کر دیتے ہیں - اگلے وقتوں میں تو باقاعدہ بالیاں بھی آویزاں کرائی جاتی تھیں ان کانوں میں مگر فی الوقت ہم فقط چھید پر ہی گذارا کر لیتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں مہنگائی کے ہاتھوں ایسا کرنا شائد ممکن نہیں رہا - عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ چونکہ نو دس بہنوں کے بعد پہلے "نر" بچے پیدا ہوئے تھے اس لئے ان کے والدین نے نہ صرف یہ کہ ان کے کان چھدوا کر بالیاں پہنائیں بلکہ اسے زنانہ کپڑے بھی پہنائے جاتے تاکہ وہ حاسدوں کی بری نظروں سے محفوظ رہیں-

☆☆☆☆☆

کتے سے بچنے کا آسان طریقہ

ہمارے ملک کی کوئی گلی، کوچہ، محلّہ، ٹاؤن ایسا نہیں ہوگا۔ جہاں کتے نہ پائے جاتے ہوں۔ اس جانور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وفادار ہے۔ کتے کے بھونکنے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ کتا ہے تو بھونکے گا ضرور۔ ہمارے گھر کے سامنے حکیم صاحب کا گھر ہے۔ ہم چھوٹے تھے جب ایک دن اُن کے گھر بڑے سائز کا کتا دیکھا۔ اس کتے کا قد کاٹھ اور دہشت اتنی تھی کہ اگر وہ کبھی گلی میں آجاتا تو گلی سنسان ہوجاتی۔ ایسا کئی بار ہوا کہ وہ کتا گیٹ میں آکر کھڑا ہوتا اور بھونکنے لگتا۔ ہمیں ایمرجنسی میں دکان سے کچھ لانا ہوتا، مگر گیٹ کھول کر باہر نکلنے کی ہمّت نہ ہوتی۔ دروازے میں بنے لیٹر بکس سے دیکھتے رہتے۔ جب تک کتا حکیم صاحب کے گھر نہ چلا جاتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کتے کی رسی گھر کے کسی فرد کے ہاتھ میں ہوتی۔ پھر بھی قریب جانے سے دل ڈرتا رہتا۔

اردو ادب میں کتوں کے بارے میں بہت سی دلچسپ تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں، جن میں اس جانور کی نفسیات کو بڑے منفرد اور پُرلطف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ معروف مزاح نگار پطرس بخاری نے اس حوالے سے خوب لکھا ہے۔ ان کی تحریر ''کتے'' کا ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

''علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سر کھپاتے رہے، لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لے لیجیے دودھ دیتی ہے، بکری کو لیجیے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے، وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا، تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔ کل ہی کی بات ہے، رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے

رانا محمد شاہد

کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا، ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر نکلے اور بھنا کر پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے، سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر آرڈر پکارا، لیکن ان موقعوں پر دھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب اُن سے پوچھیے کہ میاں تمھیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے۔ یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو سنانا کون سی شرافت ہے۔"

زمانۂ طالب علمی کی بات ہے۔ ہم سب محلے دار دوستوں کو سکول جانے کے لیے ایک کوٹھی سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ یہ کوٹھی ایک ڈاکٹر کی تھی اور سکول جانے کے لیے شارٹ کٹ راستہ۔ بعض اوقات جب سکول لگنے میں بہت کم وقت رہ جاتا تو یہی کوٹھی ہماری مددگار ہوتی اور اسمبلی کے دوران یا بعد میں ملنے والی سزا سے ہمیں بچا لیتی۔ ہم ایک گیٹ سے داخل ہوتے اور دوسرے سے نکل جاتے۔ کوٹھی کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ آس پاس گھر تھے اور درمیان میں بائیں طرف بڑی کوٹھی۔ ڈاکٹر صاحب کی بڑی فیملی تھی۔ بچوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ آس پاس کے گھروں میں بچے رہتے تھے اور کوٹھی میں خود ڈاکٹر صاحب۔ ایک گیٹ سے دوسرے گیٹ تک گزرگاہ تھی۔ جہاں سے ہمارے علاوہ سکول جانے والی لڑکیاں اور بازار جانے والی خواتین میں گزرتی تھیں کہ یہ شارٹ کٹ تھا۔ کوٹھی والے بھی نہیں روکتے تھے کہ لوگوں کے لیے سہولت ہے۔ مگر اس کوٹھی یا راستے کا سب سے بڑا مسئلہ وہاں موجود دو کتے تھے۔ معروف افسانہ نگار انتظار حسین نے کتوں کی کچھ اقسام گنوائی ہیں۔ گلی کے کتے، کوٹھی کے کتے اور ولایتی کتے۔ آپ انھیں کوٹھی کے کتے کہہ لیں۔ انتظار حسین کوٹھی کے کتے کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "گلی کا کتا تو آدمی، آدمی میں امتیاز کر لیتا ہے۔ مگر کوٹھی کا کتا اس امتیاز کا مطلق قائل نہیں۔ اس کی سڑک سے جو نکلے گا، وہ اس پر قاتلانہ حملہ کرے گا۔ کوٹھیوں والے اندر پڑے سوتے ہیں اور سڑک پر کوئی ایسا آدمی نہیں ہوتا، جو ان کتوں کو اللہ کا خوف دلائے۔"

کوٹھی میں موجود ان کتوں میں سے ایک خاصا بڑا تھا۔ جسے دیکھتے ہی انسان خوفزدہ ہو جائے۔ عموماً اسے گزرگاہ کے ساتھ موجود خالی پلاٹ میں باندھ کر رکھتے تھے، مگر جب وہ لمبی سی زبان نکال کر زور زور سے بھونکتا تھا تو گزرنے والوں کے دل دہل جاتے تھے، پھر انھوں نے

گزرگاہ کے ساتھ ایک چار دیواری بنا کر وہاں باندھنا شروع کیا۔ اس سہولت کے باوجود جب ہم اس چار دیواری کے پاس سے گزرتے تو کتے کی پہلی آواز کے ساتھ ہی دعا پڑھنا شروع کر دیتے، کہیں پڑھا تھا کہ قانون کے مطابق عوامی مقامات پر پالتو کتا کھلا چھوڑنا ازخود غیر قانونی ہے، مگر یہ عوامی کوٹھی یا مقام نہیں تھا بلکہ عوام نے اپنی سہولت کے لیے یہ فائدہ اُٹھایا۔ یوں یہاں کتے غیر قانونی کام نہیں کر رہے تھے بلکہ گزرنے والے کر رہے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کوٹھی سے کوئی بڑا یا بچہ ہماری مدد کے لیے آ جاتا اور جب تک ہم دوسرے گیٹ سے گزر جاتے۔ وہ وہیں کھڑا رہتا۔ ایسا عموماً خواتین کے لیے ہوتا۔ ہمیں کبھی کبھار ہی یہ سہولت میسر آتی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ بڑا کتا انھوں نے فروخت کر دیا یا اس کا کیا بنا، ہمیں نہیں معلوم، مگر پھر وہ ہمیں نظر نہ آیا۔ اب اُن کا ایک سفید ڈبو اس راستے پر بھاگا پھرتا اور ہر آنے والے پر بھونکتا۔ وہ سفید کتا چھوٹا بھی تھا اور خوبصورت بھی۔ سفید رنگ کے گھنے بال اس پر بہت اچھے لگتے تھے۔ اس لیے زیادہ خوف محسوس نہ ہوتا۔ تاہم ہم اس کے بھونکنے پر اس کی طرف دیکھے بغیر تیز تیز قدموں سے گزر جاتے۔ کبھی وہ دوسرے گیٹ تک ہمارا پیچھا بھی کرتا۔ ہم نے من رکھا تھا کہ کتا جب بھونکتے ہوئے آپ کی طرف بڑھے تو آپ تیز تیز قدموں سے چلنے کے بجائے رُک جائیں تو وہ نہ صرف بھونکنا بند کر دے گا بلکہ خاموش ہو کر واپس بھی چلا جائے گا۔ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ ہاں اس دوران یہ خوف بھی دامن گیر رہتا کہ کہیں کاٹ ہی نہ لے۔ عام حالات میں بازار جانا ہوتا تو اکثر اسی کوٹھی سے گزر کر جاتے۔

یہ 18،17 سال پہلے کی بات ہے۔ ابو گول چوک میں ایک ڈرنک کارنر پر کام کرتے تھے۔ ایک دن عصر سے پہلے مجھے دکان کی کوئی چیز انھیں واپس پہنچانی تھی۔ چنانچہ اسی سوچ کے ساتھ کوٹھی کے اس راستے سے تیز قدموں کے ساتھ گزر رہا تھا کہ اچانک وہ سفید کتا بھاگتا اور بھونکتا ہوا میرے پیچھے آیا۔ وہ مسلسل بھونک رہا تھا۔ اسی خیال پر عمل کرتے ہوئے میں رک گیا وہ خاموش ہوا تو میں نے اسے ڈرا کر ایک قدم آگے بڑھایا اور پھر اس نے میری ٹانگ پر کاٹ لیا۔ میں نے جلدی سے خود کو چھڑوایا۔ اس دوران کسی شخص نے دیکھا تو وہ بھاگ گیا۔ اب میں جلدی جلدی ابو کو دکان پر وہ چیز دے کر واپس آیا۔ راستے میں ٹانگ پر ہلکی ہلکی ٹیس محسوس ہوئی۔ مگر تکلیف کا احساس جھٹک کر تیز تیز قدموں سے گھر آ گیا۔ گھر آ کر امی اور ہمشیرہ کو بتایا۔ انھوں نے ٹانگ دیکھی۔ خون کے دھبے تھے اور کتے کے دانتوں کے نشان بھی موجود تھے۔ یہ سب دیکھ کر امی تو بہت پریشان ہوئیں۔ انھوں نے بڑے بھائیوں کو بتا دیا۔ ایک بھائی تو مذاق کرتا رہا کہ اب اسے 14 انجکشن لگیں گے اور یہ کہ اگر انجکشن نہ لگوائے تو معاملہ خراب ہو سکتا ہے، انسان بھی

کتا بن جاتا ہے اور ویسے ہی بھونکنے لگتا ہے وغیرہ۔ مجھے لگا بھائی کہیں یہ نہ کہہ دے کہ تم بھی کتے کو کاٹ لیتے تو شاید ٹیکوں کی پریشانی سے بچ جاتے اور خبر بھی بن جاتی۔ یہ بات خبر کی پرانی اصطلاح کو یاد کرتے ہوئے ذہن میں آگئی، جس کے مطابق ''اگر کتا کسی انسان کو کاٹ لے تو وہ خبر نہیں بلکہ اگر انسان کسی کتے کو کاٹ لے تو وہ خبر ہوگی۔'' ہمارے ہاں ایسی خبریں آتی رہی ہیں۔ چند سال پہلے کی اخبار کی خبر یاد آگئی۔ جس کے مطابق سابق گورنر پنجاب غلام مصطفیٰ کھر کے پالتو کتے کو زخمی کرنے پر شہری پر مقدمہ درج کروا دیا گیا۔ غریب شہری نے کتے کو جان بوجھ کر زخمی نہیں کیا ہوگا، عمل کا ردعمل ہوگا۔ مگر امیر شہری کا پالتو کتا بھی غریب شہری کے برابر نہیں ہوسکتا۔ یہ خوش قسمت کتے ہیں کہ جن کے زخمی ہونے پر شہریوں پر مقدمات درج ہو جاتے ہیں۔ خیر بھائی کے اس طرح کے مذاق کے بعد امی مزید پریشان ہوگئیں۔

مگر گھر والے مطمئن نہ تھے۔ اس وقت کتے کے کاٹے کی ویکسین تحصیل کے بجائے ضلع سے ملتی تھی۔ وہ رات اسی پریشانی میں گزر گئی۔ اگلی دوپہر تک گھر کا موضوع گفتگو میری ٹانگ تھی۔ اسی وجہ سے پریشانی بھی زیادہ تھی۔ شام کو بڑے بھائی کے ساتھ محلے کے واحد میڈیکل سٹور پہ گیا۔ ان سے تفصیلی بات ہوئی۔ میڈیکل سٹور کے مالک ساجد بھائی مذاق میں کہنے لگے کہ اسے کس نے کہا تھا وہاں سے گزرے۔ وہ تو خواتین کے گزرنے کے لیے راستہ ہے۔ پھر کہنے لگے آپ رات کو ڈاکٹر صاحب کے کلینک چلے جائیں۔ ان کا کتا ہے۔ وہ زیادہ بہتر بتا سکیں گے۔ اگر وہ انجکشن کا کہیں تو ضرور لگوائیں۔ کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوں تو بائیں طرف ان کا کلینک تھا۔ جہاں وہ رات کو بیٹھتے تھے۔ دن کے وقت سرکاری ڈیوٹی پر ہوتے تھے۔ رات کو ہم اُن کے سامنے بیٹھے تھے۔ انھیں ساری صورتحال بتائی تو وہ مسکرا دیئے اور ہلکے پھلکے مذاق کے بعد کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ انجکشن عموماً آوارہ کتوں کے لیے ہوتا ہے۔ یہ ہمارا پالتو کتا ہے۔ انجکشن کی ضرورت نہیں۔ دو چار دن میں درد کم ہوگا تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ مزید کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتایئے گا۔ گھر کے پاس کلینک ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کتا تھا چنانچہ ان کی طرف سے تسلی کے بعد ہم گھر لوٹے۔ بھائی نے جب امی اور باقی افراد کو ساری بات بتائی تو وہ بھی مطمئن ہوگئے۔

اپنی زندگی کا یہ واقعہ ناصر کاظمی کے حوالے سے احمد عقیل روبی کی یہ تحریر پڑھ کر یاد آگیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ناصر کاظمی کتوں سے بہت ڈرتے تھے۔ کتے کو دور سے دیکھ کر راستہ بدل لیتے۔ کہا کرتے تھے کہ پیٹ میں آٹھ ٹیکے لگوانے سے بہتر ہے کہ آدمی اپنا سفر دو فرلانگ اور لمبا کر لے۔ انھوں نے چڑیوں، راستوں، گلیوں اور سڑکوں سے

آشنائی پیدا کی، مگر کتے سے راہ و رسم نہ بڑھا سکے۔ کبھی کبھی وہ اس خوف سے کسی نہ کسی کو اپنا ہم سفر بنا لیتے تھے جو انھیں گھر تک پہنچا آئے۔ ایک دفعہ شدید سردی کے موسم میں رات کے ایک بجے مجھے ہاسٹل کے چپڑاسی نے کہا کہ آپ کو ناصر کاظمی بلا رہے ہیں۔ میں نیچے اترا تو وہ ہوسٹل کے لان میں ناصر کاظمی ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے "کیا کر رہے ہو؟"

"پڑھ رہا تھا" میں نے جواب دیا۔ "تم پڑھ رہے ہو، رات کا قافلہ روانہ ہونے کو ہے۔" میں اپنے کمرے میں گیا۔ میرا روم میٹ دانش رضا سو رہا تھا۔ میں نے چپکے سے اس کا اوور کوٹ اٹھایا جو اس نے پچھلی شام ہی لنڈے سے خریدا تھا اور نیچے اتر کر ناصر کاظمی کے ساتھ ہو لیا۔ انارکلی، میکلوڈ روڈ، مال سے ہوتے ہوئے ہم کرشن نگر میں داخل ہوئے۔ تین بج چکے تھے۔ کتے بوکھلائے ہوئے پھر رہے تھے۔ کتوں کے سلسلے میں، میں ناصر سے بھی زیادہ ڈرپوک تھا۔ مگر میں نے کبھی ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ہم کتوں سے بچتے بچاتے ناصر کاظمی کے گھر تک آئے۔ انھوں نے دستک دی۔ دروازہ کھلا، وہ اندر داخل ہوئے۔ مجھے خدا حافظ کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ میں واپسی کے لیے پلٹا تو دس کتوں کا ایک جاندار دستہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے قدم بڑھایا تو وہ بھونکنے لگے۔ میں چلا تو پیچھے دوڑے۔ میں دوڑا تو انھوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ناصر کاظمی کا گھر بالکل چند قدم پر تھا۔ مجھے اور تو کچھ سوجھا نہیں، میں نے اوور کوٹ اتار کر چاروں طرف لہرایا تو کتے اور شیر ہو گئے۔ اپنے اس دفاعی قدم میں، میں نے ذرا تیزی دکھائی تو کوٹ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک کتے پر جا گرا اور گرا بھی اطرح کے اوور کوٹ کے بازوؤں میں اس کا سر پھنس گیا۔ وہ اس وقت آفت ناگہانی سے گھبرا گیا اور اوور کوٹ کے بازو سے اپنا سر نکالنے کے لیے چاروں طرف گھومنے لگا۔ کتے کو اپنے سر کی پریشانی تھی۔ مجھے اس کوٹ کی پریشانی تھی جو دانش رضا نے کل خریدا تھا کتے کے چاروں طرف چکر لگانے سے سب کتے کوٹ کو ایک بلا سمجھ کر بھاگ گئے اور میں کتے سے کوٹ چھیننے کی تگ و دو کرنے لگا۔ کتا 50 گز کے دائرے میں دیر تک بھاگتا رہا اور میں کتے کے پیچھے دوڑتا رہا۔ آخر کتے نے زور لگا کر سر کو کوٹ کے بازو سے نکالا۔ کوٹ اوچھل کر دور جا گرا۔ کتے کے چہرے پر بلا کا خوف تھا۔ اس نے چند لمحے کوٹ کے بے ترتیب بکھرے بازوؤں کو دیکھا اور پھر بھونکنے کے بجائے ایک خوفناک چیخ مار کر بھاگ گیا۔ میں نے جا کر کوٹ اٹھایا تو ناصر کاظمی نے اپنی کھڑکی سے جھانک کر کہا۔ "Good یار کتے سے بچنے کا یہ تو بہت آسان طریقہ ہے۔ میں یوں ہی ڈرتا رہا۔ کل میں بھی ایک اوور کوٹ خریدوں گا۔" اور کھڑکی بند کر لی۔

☆☆☆☆☆

غزل

گم راہ بھی ہم کبھی رہے ہیں
اس فخر میں کچھ عجب نشے ہیں

ہم پر نہ چلے گا بس تمہارا
ہم لوگ یہ جنگ لڑ چکے ہیں

کب ظلم ہوا کے ختم ہوں گے
پر کھول کے خاک ہو گئے ہیں

ہر گام ہے مرحلوں کی منزل
یک رنگ تمام راستے ہیں

مرنے کے بھی ان گنت بہانے
جینے کو بھی لاکھ مسئلے ہیں

اک رو میں ، ہیں رہروانِ دنیا
کچھ دیکھتے ہیں نہ سوچتے ہیں

ہر آن، کچھ آہٹوں سی خوشبو
ہر چاپ، گلاب سے کھلے ہیں

باتوں میں چھپا رہے ہیں باتیں
جتنے دکھ ہیں سب اَن کہے ہیں

دیواروں کے شگاف خالد
یادوں کی چھتوں تک آ گئے ہیں

خالد احمد

غزل

ایسی اوقات پہ ہم کتنے ہوئے ہیں حیران
اپنے دل میں کوئی گوشہ نشیں ہے انسان

ہم پہاڑوں پہ محبت کی اڑا دیتے ہیں تان
بانسری اور یہ وادی ہے ہماری پہچان

ہم بھی تلوار کے کچھ ہاتھ دکھا سکتے ہیں
پاس گھوڑا بھی ہے اور یہ حاضر میدان

دور سے ہم کو کئی شہر بلاتے ہیں مگر
اس بیاباں سے نہیں اپنے سفر کا امکان

اور پیرایہ کوئی دل کو نہیں ہے بھائے
ہم نے دیکھی ہے اسی طرز سخن کی شان

ہم اکیلے ہیں مگر بن میں بسے ہیں ثاقب
عشق فرمائیں گے اور پورے کریں گے ارمان

آصف ثاقب

غزل

بے آس ہو گئے ہیں ہم اُس مہربان سے
پھر بھی کسی طرح نہیں جاتا وہ دھیان سے

تھا کیا ہمارے پاس جو دیتے جہان کو
ہم نے تو بس لیا ہی لیا ہے جہان سے

محتاج تاج کی نہیں ہوتی قلندری
عمرِ عزیز ہم نے گزاری ہے آن سے

آتے ہیں باز ارض و سما میں کہاں بھلا
حشرات رینگنے سے ، پرندے اُڑان سے

ضائع نہیں گیا کبھی سننا کسی کا حال
حاصل ہوئے سبق ہمیں ہر داستان سے

آئے ہیں جب سے جامعۂ زندگی میں ہم
پیہم گزر رہے ہیں کسی امتحان سے

تمغے تمھیں قبول نہیں ہیں تو کیا شعور
لائیں ستارے توڑ کے ہم آسمان سے

انور شعور

غزل

دُھن اس کی دن رات ضروری ورنہ بات ادھوری
اس کے نام حیات ضروری ورنہ بات ادھوری

واجب ہے آگے آگے لہراتا خواب پھریرا
رکھنی پیچھے ذات ضروری ورنہ بات ادھوری

اندر باہر ایک نہیں تو لیکھ لکھیں خود کیسے
پاس ہو یہ سوغات ضروری ورنہ بات ادھوری

سہل نہیں اِن دشمن رستوں شوق سفر ہو پورا
اپنے رُخ بھی گھات ضروری ورنہ بات ادھوری

ہمراہی ہونے سے منزل ایک نہیں ہو جاتی
دل سے دل کا ساتھ ضروری ورنہ بات ادھوری

سبز رتوں کی شادابی ہر گوشۂ باغ تک آئے
سب شاخوں پر پات ضروری ورنہ بات ادھوری

موسم چاہے مجبوری کا جتنا درد بڑھائیں
دل میں ایک نشاط ضروری ورنہ بات ادھوری

سوکھے حرفوں کیسے ممکن سینوں کی سیرابی
اشکوں کی برسات ضروری ورنہ بات ادھوری

باہر سے ہشیار مسلسل کبھی کبھی پر عالی
اندر بھی اک جھات ضروری ورنہ بات ادھوری

جلیل عالی

غزل

پرائے دکھ بھی اپنے ہو گئے ہیں
سبھی رنگ ایک جیسے ہو گئے ہیں

برے دن ہیں مگر کچھ ان دنوں بھی
بہت سے کام اچھے ہو گئے ہیں

گزرتے ہی نہیں لمحوں کی صورت
نہ جانے کیسے لمحے ہو گئے ہیں

سمجھتی ہے وہ خود کو شاہزادی
تو کیا ہم شاہزادے ہو گئے ہیں

لکھی ابلیس نے جھوٹی کہانی
مگر کردار سچے ہو گئے ہیں

بہت احسن طریقے سے بنے تھے
مگر ہم لوگ کیسے ہو گئے ہیں

عجب دیوار ہے ہستی ہماری
دریچے ہی دریچے ہو گئے ہیں

مگر اب تو ہمارے روز و شب بھی
عدالت کے کٹہرے ہو گئے ہیں

پیامی کو قضا نے آ لیا ہے!
کبوتر، باز جیسے ہو گئے ہیں

بڑے خوش بخت ہوتے ہیں گداگر
بہت سے کھاتے پیتے ہو گئے ہیں

محسن اسرار

غزل [خالد احمد کی نذر]

رات آئی ہے ، سحر کی سوچیں
ہم اُجالے کے سفر کی سوچیں

عزم ہی خوف و خطر سے گزرے
وسعتِ حدِّ نظر کی سوچیں

روشنی دل میں اُترتی جائے
رَوِشِ شمس و قمر کی سوچیں

جس میں حد ہے ، نہ قرینہ، نہ لحاظ
نارسائی سے حَذَر کی سوچیں

مستقل بادیہ پیمائی کیا
کبھی یکسوئی سے گھر کی سوچیں

بے ثمر پیڑ ہوا ہے کیوں کر!
کسی شاداب ہُنَر کی سوچیں

منہدم ہو گی عمارت ساری
پختہ دیوار کی ، در کی سوچیں

حُسنِ انساں ہی کو لے ڈوبی ہیں
زہر ہیں تیغ و تبر کی سوچیں

زہر آلود ہوا ہے اُسلُوب
تنگ ہیں برق و شرر کی سوچیں

لُٹ گیا تاج تو نوحہ کیسا
خم نہ کھاتے ہوئے سر کی سوچیں

چھوڑ دیں قصۂ پارینہ کو
آج کی تازہ خبر کی سوچیں

رنگ شعروں کا نِکھر جائے ریاض
ہم اگر خونِ جگر کی سوچیں

سید ریاض حسین زیدی

غزل

حصارِ حاشیۂ کُن فکاں سے آگے چلیں
کبھی تو سرحدِ کون و مکاں سے آگے چلیں

ہمیں سلیقۂ منزل نُمائی آتا ہے
غُبار بن کے ہم اِس کارواں سے آگے چلیں

پیام دیتی ہے اِس کائنات کی وسعت
کہ ہم پُرانے زمیں آسماں سے آگے چلیں

یہاں رہیں گے تو ہونا پڑے گا خاک ہمیں
اِرادہ ہے کہ ہم اِس خاکداں سے آگے چلیں

ابھی تو اَور کئی انکشاف باقی ہیں
نہاں کی کھوج میں نکلیں، عیاں سے آگے چلیں

بچھی ہوئی ہے ستاروں کی کالی راکھ یہاں
یہاں اندھیرا بہت ہے، یہاں سے آگے چلیں

اُدھر کی تیرگیوں میں بھی روشنی ہو گی
یہ دیکھنے کے لئے کہکشاں سے آگے چلیں

ہماری پیاس کی شِدّت کا یہ تقاضا ہے
یہ پیاس لے کے ہم آبِ رواں سے آگے چلیں

لُغت میں لفظوں کے معنی کُچھ اَور لکھے ہیں!
سو گوشوارۂ سُود و زیاں سے آگے چلیں

ہمیں جو وقت کی گردش پہ اختیار ہو کچھ!
تو اپنے قافلۂ رفتگاں سے آگے چلیں

یہ فیصلے کی گھڑی ہے، یہ سوچنا ہے نسیم
کہ پیچھے لوٹ چلیں یا یہاں سے آگے چلیں!

نسیم سحر

غزل

اک دشتِ بلاخیز میں پیاسا مجھے رکھا
دو دن نہ عدو نے لبِ دریا مجھے رکھا

جب خیمۂ جاں میں ہی سلگنا تھا مقدر
پھر دھوپ میں کیوں صورتِ صحرا مجھے رکھا

وہ خواب پریشاں تھا کہ جھپکی نہ گئی آنکھ
اس حال میں یوں محوِ تماشا مجھے رکھا

پابندِ سلاسل میں رہا نوحہ بلب بھی
جب قریۂ بے مہر میں تنہا مجھے رکھا

میں ہوں کہ زر و مال کی خواہش نہیں دل میں
خواہش نے مگر طالبِ دنیا مجھے رکھا

سر میرا گیا قامتِ نیزہ پہ سرِ شام
قاتل نے مگر قد سے بھی اونچا مجھے رکھا

تھی درد کی دولت ہی حسنؔ کیسۂ دل میں
پھر کس لیے معتوبِ زمانہ مجھے رکھا

حسن عسکری کاظمی

غزل

آنکھوں کے سامنے تھا کھنڈر سا، میں رو پڑا
کل خود کو آئنہ میں جو دیکھا، میں رو پڑا

مدّت کے بعد یار کے کوچے جو میں گیا
سونا پڑا تھا ایک جھروکا، میں رو پڑا

اس جشن میں کوئی بھی ترا آشنا نہیں
جب دل یہ دے رہا تھا دلاسا، میں رو پڑا

محفل میں مل رہا تھا وہ سب سے، تپاک سے
چپ چاپ میرے پاس سے گزرا، میں رو پڑا

کچھ خط پرانے دیکھ رہا تھا میں رات کو
اک خط میں دیکھا خشک سا پتا، میں رو پڑا

سنسان راستہ تھا، اندھیرا تھا، دشت تھا
ہاتھوں سے کوئی لے اڑا نقشہ، میں رو پڑا

اک دوسرے میں سارے مگن ناچتے رہے
اس بزم میں تھا میں ہی اکیلا، میں رو پڑا

ناصر علی سیّد

غزلیں

نہ جانے کون کس کو کھو رہا ہے
پسِ دیوار کیا کیا ہو رہا ہے
ہماری دوربیں آنکھوں سے دیکھو
گھٹاؤں میں سمندر سو رہا ہے
کئی دن سے مرا کچا گھروندا
مسلسل بارشوں سے رو رہا ہے
یہ کیسی سوچ در آئی ہے مجھ میں
ابھی میرا مقدر سو رہا ہے
شجر سے سبز پتوں کو گرا کر
ہوا کا شوق پورا ہو رہا ہے

یعقوب پرواز

جیسے گردوں کے ستارے مختلف
ہیں مقدر بھی ہمارے مختلف

ہو نہیں سکتا کبھی یکساں سلوک
گر ہوں اوپر سے اشارے مختلف

تیری ہستی کے مظاہر ان گنت
جابجا جن کے نظارے مختلف

کیا کریں نفع و ضرر میں امتیاز
سود سب کا اور خسارے مختلف

وہی جو حکمراں ہے خشک و تر کا
سمندر میں جزیرے بو رہا ہے
عقیدہ ہے یہ میری بے بسی کا
جسے جو کاٹنا ہے، بو رہا ہے
ہے بوڑھے باپ کا معصوم وارث
جو میت کے سرہانے رو رہا ہے

اپنی منزل ایک بحرِ بے کراں
پھر ہیں کیوں سوچوں کے دھارے مختلف

جس نے قطروں کو سمندر کر دیا
کیوں ہے دنیا اس کے بارے مختلف

غزل

ملتی ہے اس طرح بھی محبت کبھی کبھی
ہوتی ہے اپنے بخت پہ حیرت کبھی کبھی

ہم جانتے ہیں عشق سفر عمر بھر کا ہے
تیرے لیے سہی یہ مسافت کبھی کبھی

تکتے ہیں آئنہ ترے ہاتھوں میں رشک سے
جن کو بہم ہے دید کی مہلت کبھی کبھی

تسلیم انحصار ترا کوہ پر مگر
پڑتی ہے کاہ کی بھی ضرورت کبھی کبھی

پہلی نوازشوں کو بھلانا روا نہیں
ہو بھی اگر کسی سے شکایت کبھی کبھی

چھپنا اسی سے، چاہنا بھی جس کے سامنے
کھلتی نہیں جمال کی حکمت کبھی کبھی

گلزار مستقل نہیں پھولوں کا ساتھ بھی
کرتی ہیں تتلیاں بھی عنایت کبھی کبھی

گلزار بخاری

غزلیں

ریگِ صحرا تو کبھی آبِ رواں دیکھتے ہیں
مَیں یہی دیکھتا ہُوں، لوگ کہاں دیکھتے ہیں

حلقۂ چشمِ غزالاں میں اگر آئے ہیں
کوئی دن اور تماشائے بتاں دیکھتے ہیں

شہرِ خوباں میں نظر آتا ہے کیا کیا ہم کو
آؤ آنکھوں کو پرے رکھ کے یہاں دیکھتے ہیں

شیخ صاحب کو زباں پر نہ بیاں پر قابو
رَو میں بہ جائیں تو پھر مُڑ کے کہاں دیکھتے ہیں

اور کیا دیکھتے ہیں جانے یہ دُنیا والے
تُو ہی آتا ہے نظر ہم تو جہاں دیکھتے ہیں

خاور اعجاز

اگرچہ شہرِ جاں میں غم نیا کوئی نہیں ہے
مگر جو ہم پہ گذری دیکھتا کوئی نہیں ہے

چراغوں کو بھی مشکل ہو رہا ہے سانس لینا
کئی دن سے دریچوں میں ہَوا کوئی نہیں ہے

یونہی چلتا رہے گا کاروبارِ زندگانی
یہ دھوکا سب کو تھا لیکن رہا کوئی نہیں ہے

اِسی خاطر کیا ہے فیصلہ صف بندیوں کا
ہمیں معلوم ہے اَب راستہ کوئی نہیں ہے

ہمارے ہی عمل کی ہے سپیدی اور سیاہی
زمانہ خود سے تو اچھا بُرا کوئی نہیں ہے

غزل

خبر نہیں کہ ملیں ہم زباں کہیں نہ کہیں
ہماری ہو گی مگر داستاں کہیں نہ کہیں

کہاں کہاں لیے پھرتی ہے اک خیال کی رو
ہمارے دل سا بھی ہو گا سماں کہیں نہ کہیں

ضرور ملتا رہے گا مٹانے والوں کو
ہمارے بعد ہمارا نشاں کہیں نہ کہیں

شجر شجر پہ یہ سرگوشیاں ہیں پتوں کی
کہ فصلِ گل میں بھی ہو گی خزاں کہیں نہ کہیں

لہو جو دل کا جلائے ہوئے ہے کیا شے ہے؟
اگر ہے آگ تو ہو گا دھواں کہیں نہ کہیں

اختر شمار

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ عیب، ہنر سے

غزل

زباں کہنے سے قاصر ہے، جو حالِ زندگی دیکھا
بنامِ ارتقا ، پیہم ، زوالِ زندگی دیکھا

جو تھے پرواز میں یکتا، ملے وہ خاک میں اک دن
عروجِ زندگی دیکھا ، زوالِ زندگی دیکھا

حوادث کے بدن پر زخم لے کر پاؤں میں چھالے
ہراساں زندگی سے ہر غزالِ زندگی دیکھا

ستم ہائے فلک بھی ہمرکابِ یورشِ صرصر
خزاں کے جبر کی زد میں نہالِ زندگی دیکھا

اگرچہ موت برحق ہے، قضا کے سامنے پھر بھی
ہر اک پھیلا ہوا دستِ سوالِ زندگی دیکھا

نہ کوئی خوف مرنے کا نہ جینے کا کوئی مقصد
فشارِ فکر میں الجھا خیالِ زندگی دیکھا

ہمیں لگتا ہے اب تک کچھ نہیں دیکھا زمانے میں
اگرچہ عمر بھر ہم نے جمالِ زندگی دیکھا

وسائل کی فراوانی ہے گو ہر شخص کو حاصل
مگر اعصاب پر غالب وبالِ زندگی دیکھا

سبھی احباب تجھ کو آفریں تحسین کہتے ہیں
ترے اشعار میں سب نے کمالِ زندگی دیکھا

رشید آفرین

غزل

ہم نے کب پائی ہے اپنی زندگی
جی رہے ہیں ہم کسی کی زندگی

آپ کے ہاتھوں سے وہ جاتی رہی
آپ نے جتنی کمائی زندگی

زندگی سے کچھ ہوئے مایوس تو
عین اس دم گدگدائی زندگی

صبح دم کتنے پرندوں نے مجھے
گیت کی صورت سنائی زندگی

تیرے بارے میں کرے گی فیصلہ
بن گئی ہے تیرا قاضی زندگی

اس کو ثاقبؔ جب کہا آداب تو
مسکرائی پاس آئی زندگی

منظور ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر سو تھے ، ہمی غبار فرما
تو تھا کہ ہوا کا قہقہہ تھا

غزل

سحر دم جو تلاوت کر رہا ہوں
نیا دن خوبصورت کر رہا ہوں

پرانے پیڑ پہ پھل آئے تازہ
شجر ہوں اور عبادت کر رہا ہوں

مری دستک پہ تم آواز دینا
بڑی مشکل سے ہمت کر رہا ہوں

پرندے گھر سے خالی چونچ نکلے
عجب حالت میں ہجرت کر رہا ہوں

کسی درویش کی آنکھوں کا صدقہ
جو دنیا سے محبت کر رہا ہوں

مرا دشمن مرے اندر چھپا ہے
میں خود اپنی حفاظت کر رہا ہوں

میری چھت پہ بہت حمد و ثنا ہے
پرندوں کی ضیافت کر رہا ہوں

عمارت گر چکی ملبہ ہوا سب
بدن ٹوٹا مرمت کر رہا ہوں

وہ اپنا جرم ثابت کر چکا ہے
میں اپنا جرم ثابت کر رہا ہوں

زمیں کے سب خدا چھوٹے خدا ہیں
میں اللہ سے شکایت کر رہا ہوں

آغا نثار

غزل

جو راہزن تھے انہیں راہبر سمجھتے رہے
ہم ایک عمر غلط راستوں پہ چلتے رہے

ہر اک منافع سدا ان کا ہی رہا مقسوم
سبھی خسارے ہماری طرف نکلتے رہے

یہ اور بات اندھیرے نہ چھٹ سکے پھر بھی
اگرچہ کہنے کو سورج کئی ابھرتے رہے

مزاج آشنا ہم ہی نہ موسموں کے ہوئے
وگرنہ وقت کے سانچے میں لوگ ڈھلتے رہے

اسی کے دل میں نہ پھوٹی گداز کی کونپل
وگرنہ کتنے ہی پتھر یہاں پگھلتے رہے

ہماری راہ کی سب ٹھوکریں تو مخلص تھیں
یہ اور بات کہ گر گر کے ہم سنبھلتے رہے

سخن شناس وہاں کوئی بھی نہیں تھا جلیل
سماعتوں سے اُلجھ کر حروف مرتے رہے

احمد جلیل

غزل

تن پتنگے کی طرح خاک بھی ہو سکتا ہے
تجھ سے ملنا تو خطرناک بھی ہو سکتا ہے

حد نہیں تیری عنایت کی مگر یہ تو بتا
پُر مرا دامنِ صد چاک بھی ہو سکتا ہے

گرگ بھی دیکھ کے حیراں ہیں بہیمانہ پن
اس قدر آدمی سفاک بھی ہو سکتا ہے

جس کو سیارہ سمجھتا ہے تو آب و گل کا
مرکز و محورِ افلاک بھی ہو سکتا ہے

کیا ضروری ہے کہ کرگس ہی ادھیڑیں مری لاش
جسم رزقِ خس و خاشاک بھی ہو سکتا ہے

یہ کھلا مجھ پہ ترے بندِ قبا کھلنے سے
قید طوفانِ غضب ناک بھی ہو سکتا ہے

تو نے شاید نہیں دیکھیں کبھی آنکھیں اپنی
دیکھنے والا انہیں خاک بھی ہو سکتا ہے

لاکھ ڈھوتا رہے دن رات کتابیں راحت
کیا گدھا صاحبِ ادراک بھی ہو سکتا ہے

راحت سرحدی

غزل

جھلملائے تھے شام کے سائے
ہم مگر لوٹ کر نہیں آئے
عکس پھرتے ہیں بانہیں پھیلائے
آئینے ہم نے اتنے چمکائے
ایسے وہ جسم پیاس بھڑکائے
جیسے سورج قریب آجائے
منتظر رہ گئے گھنے سائے
راہ گیر اس طرف نہیں آئے
تیرگی اِک دیے سے چکرائے
اور دیا روشنی میں مر جائے
دُور کے دوستوں سے بھر پائے
ہم یہاں دُشمنوں کے ہمسائے
کوئی یہ اہتمام سمجھائے
کون کس وقت کس سے ٹکرائے
آنکھ بھر کر نہ دیکھنے پائے
آبِ شرمندگی کے نہلائے
پھر رہے ہو جو ایسے گھبرائے
تُم مجھے بھول تو نہیں آئے
اُس کو حق ہے دلوں پہ چھا جائے
وہ حسیں ہے تو کیوں نہ اِترائے
کب تلک ایک شخص کترائے
اَب ہمیں اور کوئی ٹھکرائے
لوگ بیٹھے ہیں دل کو اُلجھائے
کوئی دیوانہ آکے سمجھائے

صبح کی آرزو میں کفنائے
کوئی کب تک چراغ دفنائے
کسی موسم سے کیا کہیں ہائے
ہم کبھی کُھل کے کِھل نہیں پائے
تُجھ سے اظہار بھی نہ کر پائے
ہونٹ کھولے تو لفظ تھرائے
آتشِ رنج کو نہ بھڑکائے
اُس سے کہیو کہ منہ نہ کھلوائے
جن رُتوں نے گُلاب مہکائے
ہم اُنہی موسموں میں مُرجھائے
سبز قدمی کے نحس تھے سائے
چاند سورج اسی نے گہنائے
وہ جسے چاہے بام تک لائے
شہر کے شہر جس نے دفنائے
تیرے پَرتو سے آنکھ دھندلائے
اور تجھے دیکھ بھی نہیں پائے
خامشی کی بس ایک ہی رائے
گفتگو کے ہزار پیرائے

واجد امیر

غزل

صحرا بھی کیا کمال دکھاتا ہے دُھوپ میں
ذرّہ تک آئنہ نظر آتا ہے دُھوپ میں

شب بھر میں آسمان کی صُورت بدل گئی
تب کیا تھا اور کیا نظر آتا ہے دُھوپ میں

آنکھوں کی پُتلیاں جو سمٹتی ہیں دم بدم
صحرا کُچھ اور پھیلتا جاتا ہے دُھوپ میں

اندر کی آنکھ سے نظر آتا ہے صاف صاف
چھپ کے جو عکس رینگتا جاتا ہے دُھوپ میں

مجھ میں مِرے سوا بھی کسی کا پڑاؤ ہے
یہ جو کبھی جدا نظر آتا ہے دھوپ میں

اے دوست! اس کے بعد گھنی چھاؤں آئے گی
ہر عہد زندگی کو بلاتا ہے دُھوپ میں

وحشت معاوضے کی تمنائی ہی نہیں
مجنوں بس ایک نام کماتا ہے دھوپ میں

قائم تضاد ہی سے نظامِ حیات ہے
سائے کا اعتبار بھی آتا ہے دُھوپ میں

رحمان حفیظ

غزل

ہر رستہ پر خار بنا کر چلتا ہوں
قدموں کو دشوار بنا کر چلتا ہوں

تھامنا اپنا ہاتھ مری مجبوری ہے
خود کو اپنا یار بنا کر چلتا ہوں

جو بھی ساتھ چلے پر خاصا دور رہے
میں اکثر دیوار بنا کر چلتا ہوں

دشمن خالی ہاتھ سمجھ کر لڑتے ہیں
ہاتھوں کو تلوار بنا کر چلتا ہوں

لوگ اکیلا کر دیتے ہیں رستے میں
جب بھی ایک قطار بنا کر چلتا ہوں

دستاریں سر جھکنے سے گر جاتی ہیں
سر کو ہی دستار بنا کر چلتا ہوں

رستہ مجھ سے پوچھ کے آگے بڑھتا ہے
میں ایسے آثار بنا کر چلتا ہوں

دھوپ سروبہ سایہ دینے لگتی ہے
کاغذ پر اشجار بنا کر چلتا ہوں

اقبال سروبہ

غزل

کاغذ پہ کس نے کیا ہے لکھا' دیکھتی نہیں
چلنے کے بعد مڑ کے ہَوا دیکھتی نہیں

اے آنکھ! کس فریب میں کھوئی ہوئی ہے تُو
یہ خواب بھی ہے دیکھا ہُوا' دیکھتی نہیں

اک لہر' دِل میں آخرِ شب جاگ جائے ہے
اور دور تک نہیں ہے دِیا' دیکھتی نہیں

اے شام! چلنے والی نہیں تیری ایک بھی
ہے آسمان روٹھا ہوا' دیکھتی نہیں

منزل کی آس رکھتی ہے عظمیؔ رواں ہمیں
کوئی پکار، کوئی صدا دیکھتی نہیں

اسلام عظمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے صفِ ماتم ٹھہر، اے مجلسِ گریہ سنبھل!
تازہ دم، تازہ نفس، تازہ رثا آنے کو ہے

غزل

آگ جو مجھ میں بھڑکتی تھی، بجھا دی گئی کیا؟
مری مٹی بھی ہواؤں میں اُڑا دی گئی کیا؟

یہ جو قاتل کو عدالت نے بَری کر ڈالا
یہ بھی مقتول کے بچّوں کو سزا دی گئی کیا؟

ترے گھر کے در و دیوار مجھے بُھول گئے
مری تصویر بھی کمرے سے ہٹا دی گئی کیا؟

تجھے کس نے سرِ بازارِ وفا بھیجا تھا
اے مرے دل! تری قیمت بھی گھٹا دی گئی کیا؟

موسمِ ترکِ تعلق کا تو اِمکاں ہی نہ تھا
اَن کہی بات کو دانستہ ہَوا دی گئی کیا؟

موت کے گھاٹ اُترنا ہے جنھیں، جانِ انیس!
جرم کی فرد انھیں پڑھ کے سُنا دی گئی کیا؟

محمد انیس انصاری

غزل

اندھیری رات میں جو ماہتاب دیکھتا تھا
وہ خوش نظر تھا خزاں میں گلاب دیکھتا تھا

نجانے کون سی دنیا میں کھو گیا وہ شخص
جو میرے ساتھ محبت کے خواب دیکھتا تھا

وہ جانتا تھا کہ صحرا میں ایسا کچھ بھی نہیں
جو میرے پہلو میں بیٹھا سراب دیکھتا تھا

وہ جس کی خصلتیں ساری درندوں جیسی ہوں
میں ایسی قوم پہ آتے عذاب دیکھتا تھا

کوئی بقایا تو میری طرف نکلتا نہیں
میں روز رات کو کر کے حساب دیکھتا تھا

ہے کل کی بات مرے ساتھ کا ہر اک استاد
کلاس لینے سے پہلے کتاب دیکھتا تھا

اکرم ناصر

غزل

بِھڑ گئے آخر کو بھڑکائے ہوئے
میرے دشمن کے وہ پُھسلائے ہوئے

پھول قدموں میں ہیں، برسائے ہوئے
ہار گردن میں ہیں پہنائے ہوئے

کیا بتائیں کون گُل اَندام نے
روز و شب میرے ہیں مہکائے ہوئے

سب ہیں گرویدہ اُسی فانوس کے
ہم ہیں جس جلوے کے بہکائے ہوئے

سہمے سہمے پھر رہے ہیں بے نوا
کچھ غلط کاروں کے دھمکائے ہوئے

کاش کھا لیتے وہ کھانا وقت پر
دیکھتے ہیں اب جو للچائے ہوئے

کچھ نہ کچھ بنتی ہے ان سے ناروا
پھر رہے ہیں وہ جو بَولائے ہوئے

کوئی واقف ہے نہ کوئی ہم زباں
ہم عبث ہیں اس جگہ لائے ہوئے

ہم مسلسل آپ کے ہیں ہمقدم
آپ تو ناحق ہیں گھبرائے ہوئے

ہم نہ کیسے ہوں نظرانداز اب
اتنے پیارے ہیں یہاں آئے ہوئے

آپ کو راشد بتائیں کس طرح
جو کہا ہے اُس نے شرمائے ہوئے

ممتاز راشد لاہوری

غزل

دل سے وہم نکل جائیں گے
دن میں خواب پگھل جائیں گے

بجھ جائیں گی شمعیں ، لیکن
ہونٹ ہوا کے جل جائیں گے

شاخ پہ پتے آتے آتے
چہرے رنگ بدل جائیں گے

جب وہ آنکھیں بھر جائیں گی
ہم اشکوں میں ڈھل جائیں گے

دھوپ ستارے کھا جائے گی
سائے دھوپ نگل جائیں گے

گھر پہنچیں گے اور جمشید
خود سے دور نکل جائیں گے

جمشید چشتی

غزل

عمر بھر کی چاہتوں کا گوشوارہ ایک تھا
ہم کسی کے ایک تھے کوئی ہمارا ایک تھا

رنگ، خدّ و خال، سائے اور اُجالے اب کُھلے
تُو نہیں تھا جب یہاں منظر ہی سارا ایک تھا

خوفِ ہم رنگی نے ہم کو دُور رکھا عمر بھر
مِل نہ پائے ہم کبھی اپنا ستارا ایک تھا

اُس کی آنکھوں میں جو ڈُوبے پھر نہ پار اُترے کہیں
ایسا دریا تھا وہاں جس کا کنارا ایک تھا

ہر کسی کے واسطے تو جاں ہتھیلی پر نہیں
جس کی خاطر رائیگانی تھی گوارا ، ایک تھا

آج بیٹھے کر رہے ہیں ایک اک پَل کا حساب
وہ بھی دن تھے جینا اور مرنا ہمارا ایک تھا

یوں سمٹ آئی تھی جاذب ایک پَل میں زندگی
ایک تھی سینوں کی دھڑکن دل ہمارا ایک تھا

شکیل جاذب

غزل

کوئی خبر نہ آئی تو
پھر وہ نظر نہ آئی تو

سونے تو جا رہا ہوں میں
نیند اگر نہ آئی تو

میری حدیثِ نم تو سُن
آنکھ جو بھر نہ آئی تو

کفر سے کم نہیں یہ دھیان
دادِ ہنر نہ آئی تو

موج کے ساتھ ہو تو لوں
لوٹ کے گھر نہ آئی تو

شب کی شعاع نیلگوں
سُوئے سحر نہ آئی تو

حسنین سحر

غزل

نشاطِ شوق سے دامن بھرا نہیں ہے تو کیا
نظر تو آیا وہ مجھ سے ملا نہیں ہے تو کیا

گلی پہ کھلنے لگا نیم وا دریچہ بھی
چراغ جلنے لگا ہے، ہوا نہیں ہے تو کیا

چمن سے دور بھی ہوتے ہیں ہنستے بستے درخت
کوئی پرندہ اُدھر دیکھتا نہیں ہے تو کیا

میں روز جس کے لیے پھول لے کے جاتا ہوں
وہی دریچہ مرا آشنا نہیں ہے تو کیا

بہت اُڑا ہے جہاں میں غبار وحشت کا
یہ بار ہم سے ابھی تک اٹھا نہیں ہے تو کیا

ہم آتے جاتے ہوئے راستے میں ملتے ہیں
یہ رابطہ بھی کوئی سلسلہ نہیں ہے تو کیا

خورشید ربانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی کے دکھ ازل سے زندگی کے ساتھ ہیں
لوگ فانی ہیں مگر لوگوں کے دکھ فانی نہیں

غزلیں [نذر میر]

جب سفر میں نے اختیار کیا
راستوں نے مجھے غبار کیا

ایک خاکہ بنا کے چھوڑا تھا
جس کو رنگوں نے شاہکار کیا

روشنی میں کھڑا ہوا تھا میں
گھپ اندھیرے نے مجھ پہ وار کیا

فاصلوں کو سمیٹنے کے لیے
میں اُسے دیر تک پکار کیا

کام آئی شکستگی میرے
ٹوٹ کر خود کو پائیدار کیا

مردِ درویش کی نصیحت نے
رازِ ہستی سے آشکار کیا

دستکیں اُس کے در پہ دی ہیں نوید
جرم ہم نے یہ بار بار کیا

محمد نوید مرزا

جب تلک سانسوں کے اندر دم رہا
دل میں تیری یاد کا موسم رہا

اُس کے جانے کی اذیت کیا کہوں
دیر تک آنکھوں کے اندر غم رہا

ساعتِ ہجراں بہت بے رنگ تھی
میں خود اپنے آپ پر برہم رہا

اپنا مستقبل اُسے معلوم تھا
جس کے ہاتھوں میں بھی جامِ جم رہا

گھپ اندھیرے نے بتایا ہے مجھے
کیوں چراغِ آرزو مدھم رہا

کیا یہی قسمت میں تھا لکھا ہوا
ہر خوشی کے بعد کوئی غم رہا

حادثے سڑکوں پہ ہوتے ہی رہے
ہر گلی میں شہر کی ماتم رہا

شجرِ ممنوعہ کی لذت کیا کہیں
گردشِ حالات میں آدم رہا

غزل

جہاں جہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے
مگر کہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

وہاں ، وہاں کوئی مجھ سا ہی لازمی ہو گا
جہاں ، جہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

جہاں جہاں بھی کوئی دیکھنے کی صورت ہو
وہاں وہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

رگوں میں دوڑتے اک سرخ اضطراب کے ساتھ
رواں دواں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

ذرا شبیہہ سے ملتی تو ہو شبیہہ کوئی
کہوں ، کہ ہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

میں دونوں ہاتھ ملاتا ہوں جب دعا کے لیے
تو درمیاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

محمد سلیم ساگر

غزلیں

حصارِ وقت میں آتا نہ تھا خیال ترا
یہی تھا عیب ترا اور یہی کمال ترا

صدا یہ آئی کہ نظارگی کی تاب نہیں
جن آئنے کے مقابل ہوا جمال ترا

میانِ چشم کئی راستے بنانے لگا
پسِ حجاب دمکتا ہوا جمال ترا

کنارِ ہجر کھڑا تھا ریاضؔ اور اُسے
بلا رہا تھا اُدھر موجۂ وصال ترا

یہ مت سمجھ کہ مجھے کچھ خبر نہیں تیری
فقیر پوچھتا رہتا ہے سب سے حال ترا

ریاض رومانی

منظرِ کنجِ رفتگاں مرا دل
اِک بہت قیمتی مکاں مرا دل

جنگ تھی تیری اور میری مگر
آگیا کیسے درمیاں مرا دل

روشنی ہر طرف بکھر رہی تھی
جارہا تھا جہاں جہاں مرا دل

موسمِ رائیگاں دکھاتا رہا
تھا چراغِ رہِ خزاں مرا دل

ایک کوزے کی طرح تیرا جہاں
اور اِک بحرِ بیکراں مرا دل

توڑ دینا مزاجِ یار میں تھا
مسلکِ آئینہ گراں مرا دل

مٹنے والی ہے جو بھی شے ہے یہاں
جاوداں صرف جاوداں مرا دل

غزل

پسند کرنا تھا جس کو کہاں پسند کیا
چراغ چھوڑ کے ہم نے دھواں پسند کیا

تمھارے واسطے آسانیاں فراہم کیں
اور اپنے واسطے ہر امتحاں پسند کیا

میں اپنی بات سناتا تھا اور زمانے نے
تمھارا ذکر سرِ داستاں پسند کیا

میں اپنے بارے میں کچھ ایسا خوش گمان نہیں
زہے نصیب اگر تم نے ہاں پسند کیا

زمین سے بھی تعلق بحال رکھا ہے
یہی نہیں کہ فقط آسماں پسند کیا

خمارِ دشتِ نوردی سے بے خبر ہی رہا
وہ جس نے اپنے لیے سائباں پسند کیا

ہمارا عشق منافع مزاج تھا ہی نہیں
اسی لیے تو ہمیشہ زیاں پسند کیا

نظر قرینۂ نظارگی سے واقف ہے
اس ایک زعم میں حسنِ بتاں پسند کیا

ہمارے دل نے رکھا پاسِ وضع داری کا
عزا شعاری میں ضبطِ فغاں پسند کیا

ہر ایک شے تو مقدر میں ہو نہیں سکتی
تو کس گھمنڈ میں سارا جہاں پسند کیا

اسے بھی پار اترنے کی آس ہے جس نے
شکستہ ناؤ، پھٹا بادباں پسند کیا

ہر ایک تنکا ہے مائل بہ خستگی طالب
کہ دیکھ بھال کے کب آشیاں پسند کیا

طالب انصاری

غزل

دشتِ وحشت میں در و بام کے خط آتے ہیں
اس خرابے میں بھی آرام کے خط آتے ہیں

اب وہ دل دار بھی لکھتا ہے نصیحت نامے
مجھ سے ناکام کو کب کام کے خط آتے ہیں

کوئے رسوائی کے اڑتے ہیں کبوتر اب تک
کنجِ عزلت میں بھی الزام کے خط آتے ہیں

سارا دن دھوپ میں اندیشۂ شب رہتا ہے
میری صبحوں کو کسی شام کے خط آتے ہیں

اب لفافے سے نکلتی نہیں کوئی خوشبو
اب بھی آتے ہیں مگر نام کے خط آتے ہیں

نقش ہوتا ہے لبِ سرخ کا سرنامے پر
مجھ کو اک حسنِ ہنر فام کے خط آتے ہیں

سجاد بلوچ

کوئی ستم نیا نہیں ، کوئی کرم نیا نہیں
مرکزِ التفات بھی ، جاں ، ہدفِ خدنگ بھی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غزلیں

نہ اب وہ ذوقِ نظر ہے نہ ولولے اب کے
تمھیں تراش کے لاحق ہیں وسوسے اب کے

تمام شہر، اندھیروں میں ڈوب ڈوب گیا
بجھا دیئے ہیں ہواؤں نے یوں دیے اب کے

فرازِ طور سے اترے تو ان کا دکھ سمجھے
لباسِ درد میں لپٹے، بھلے لگے اب کے

نگاہِ یار، ہمیشہ نہ ملتفت ہو گی
خیالِ یار بھی ممکن نہیں رہے اب کے

جنوں سرشت کی قسمت ہی دشتِ ویراں ہے
مکینِ دشت، سو ہم بھی نہیں ہوئے اب کے

کسی کی یاد کا یکسر نشان تک نہ رہا
زمینِ قلب پہ گزرے وہ حادثے اب کے

جنھیں سمجھتے تھے جاں سے عزیز تر، شوکت
جدا کیے ہیں انھوں نے بھی راستے اب کے

شوکت محمود شوکت

اک نظر تیری، مری جان! ابھری ہے جب سے
ساری دنیا ہی تو انجان ہوئی ہے تب سے

کج ادائی نے تری، دل کو کیا ہے گھائل
بے رُخی سے تری، مسکان چھنی ہے لب سے

چاند چلتا ہی رہا ابر کے پیچھے پیچھے
چاندنی، یوں بھی یہاں آن ملی ہے شب سے

مجھ کو بخشی ہے مرے شعر نے شہرت، لیکن
میری عزت، مری پہچان، سبھی ہے "چھب" سے

ہم تو پہلے کی طرح، آج بھی عاجز ٹھہرے
تو بتا دے کہ تری شان بڑھی ہے کب سے

تو نے دیکھا تھا محبت کی نظر سے جس دم
زندگی اپنی تو آسان ہوئی ہے تب سے

اب ترے شہر میں تنہا نہیں ہوتا، شوکت
اب ترے شہر میں پہچان بنی ہے سب سے

غزل

مرنے کا سوچوں تو کمرہ ہنستا ہے
مجھ پر میری چھت کا پنکھا ہنستا ہے

یوں غم کی آغوش میں اکثر ہنستا ہوں
جیسے ماں کی گود میں بچہ ہنستا ہے

مولا علیؑ کا جشنِ ولادت جس دن ہو
کھول کے بانہیں خانہ کعبہ ہنستا ہے

بڑھیا کے سب آنسو تارے بنتے ہیں
چاند نگر کا تنہا چرخہ ہنستا ہے

تکتا ہوں جب اونچے پیڑ کی شاخوں کو
پاؤں تلے اک سوکھا پتہ ہنستا ہے

گلیوں گلیوں بھوک نچائے مفلس کو
اور زمانہ دیکھ تماشا ہنستا ہے

روئے گا اک روز یہ میرے مرنے پر
مجھ پر اَب جو قلم قبیلہ ہنستا ہے

کون سی منزل پر میں جنوں کی پہنچا ہوں
جس سے اپنا نام بھی پوچھا ہنستا ہے

لگتی ہے ساون کی جھڑی جب آنکھوں میں
پلکوں پر اک مہکا جھولا ہنستا ہے

جس کو آئے یاد سہانی مر کر بھی
اس کی لحد کا روتا کتبہ ہنستا ہے

کھول کے کھڑکی باہر دیکھو ذرا عقیل
سورج نکلا ، نیا سویرا ہنستا ہے

عقیل رحمانی

غزل

میں کہوں سچ تو میرا سر جائے
جھوٹ بولوں تو روح مر جائے

ہے عجب درد کی یہ دولت بھی
جو سمیٹے وہی بکھر جائے

زہر سچ کا ہے میرے اندر جو
کاش شعروں میں سب اُتر جائے

وعدہ روٹی مکان کپڑے کا
دیکھنا پھر نہ وہ مکر جائے

شام کو دیکھ کر پرندوں کو
سوچتا ہے وہ اپنے گھر جائے

دیکھ لے بن سنور کے ایک نظر
میری تقدیر بھی سنور جائے

صبح یہ شہر چھوڑ جاؤں گا
خیر سے شب اگر گزر جائے

خونِ دل سے لکھا گیا ہو جو
لفظ وہ روشنی سے بھر جائے

ہے ندیم اُس کی یہ جنم بھومی
کیسے سبھی کو چھوڑ کر جائے

ریاض ندیم نیازی

غزل

اگرچہ طے ہے کہ یہ روز و شب تماشا ہے
کسی سبب سے ہی یہ بے سبب تماشا ہے

جو ہو چکا ہے کھلا ہے کہ سب تماشا تھا
جو اس کے بعد بھی ہونا ہے اب، تماشا ہے

یہ کیا ہے زندگی اوّل تو کوئی سمجھا نہیں
جو جان پائے وہ کہتا ہے سب تماشہ ہے

بتانے لگتے ہو اکثر یقین کے معنی
یقین آئے بھی کیسے کہ جب تماشا ہے

تماشہ دیکھنا عادت سی ہو گئی ہے صغیر
مجھے بتانا کہاں، کوئی، کب تماشا ہے

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی میں کسی رُخ کا، کسی دُکھ کا ہونا
اچھا ہوتا ہے سفر میں کوئی اپنا ہونا

غزلیں

میرے حصے میں ہے تقصیر کی ذمہ داری
اور ملی ہے اسے تعزیر کی ذمہ داری

شہر کا شہر ہے تخریب کے کاموں میں مگن
چند کاندھوں پہ ہے تعمیر کی ذمہ داری

لوگ تقدیر کے پہلو سے لگے بیٹھے تھے
میں اٹھا لایا ہوں تدبیر کی ذمہ داری

دل نے جو بات چھپانی ہو اسی کی بابت
لی ہے کیوں آنکھ نے تشہیر کی ذمہ داری

لوگ سیلاب کی لہروں میں بہے جاتے ہیں
اس پہ بس جیسے ہے تصویر کی ذمہ داری

جو ہمیں خواب دکھانے کے لیے آتا ہے
کیوں اٹھاتا نہیں تعبیر کی ذمہ داری

کوئی کرتا ہی نہیں اس کو ملامت کہ سعید
سب کو معلوم ہے زنجیر کی ذمہ داری

سعید راجہ

جب ترے دل کی پناہوں میں سمٹ کر دیکھوں
چاہتا ہوں کہ تجھے دنیا سے کٹ کر دیکھوں

منتظر ہو گا سرِ راہِ تمنا کوئی
میں اگر دید کی دنیاؤں سے ہٹ کر دیکھوں

دل اسی طور لگاتا رہا آواز اگر
عین ممکن ہے کسی روز پلٹ کر دیکھوں

کچھ رعایت نہ کوئی رحم نہ جانبداری
تم جو چاہو تو میں خود سے بھی نپٹ کر دیکھوں

میرے ہونے کی کوئی اس میں نشانی ہو گی
ایک دن وقت کی زنبیل الٹ کر دیکھوں

اے مرے عکس! تو آئینے سے باہر آ جا
باہر آ جا کہ ذرا تجھ سے لپٹ کر دیکھوں

یہ جو سینے میں کوئی گردسی اڑتی ہے سعید
دل تو کرتا ہے اسی گرد میں اٹ کر دیکھوں

غزلیں

راضی بہ رضا آپ ہوا آپ کا بیمار
کس منہ سے بھلا مانگے دوا آپ کا بیمار

بے یار، مددگار پڑے دیکھا تھا خود کو
کہتے ہوئے لوگوں کو سنا آپ کا بیمار

اک بار ذرا ہاتھ تو اس نبض پہ رکھیے
ہو جائے گا پھر اچھا بھلا آپ کا بیمار

کل رات بھی وحشت نے کہیں کا نہیں چھوڑا
اِمشب بھی اسی چھت پہ رہا آپ کا بیمار

کیا کیا نہیں بھیجیں تھیں طبیبوں نے دوائیں
بیمار مگر پھر بھی رہا آپ کا بیمار

دیوانہ سمجھ کر کوئی پتھر نہ اُٹھالے
اُس وقت سے حد درجہ ڈرا آپ کا بیمار

رخشندہ کے کچھ ناز اُٹھانے کو وہ آئیں
معصوم سا اک بچہ بنا آپ کا بیمار

رخشندہ نوید

بدلتے ہی نہیں حالات میرے
کرے گا کیا مقدر ساتھ میرے

ہوا کا زور بڑھتا جا رہا ہے
ذرا ہاتھوں میں لینا ہاتھ میرے

ترے پہلو سے اُٹھ کر ہی نہ جاؤں
اجازت دیں اگر حالات میرے

بہت جلدی میں آئی اور گئی ہے
چرا کر رنگ سب برسات میرے

خیالِ یار کی برکت ہے ورنہ
مہکنا چھوڑ دیں باغات میرے

غزل

ہمیشگی سے تعارف کرایا جا چکا ہے
ہوا پہ نقش بنا کر دکھایا جا چکا ہے

بکھرا نہ تھا ابھی پہلے قدم کا خمیازہ
کہ اس سے اگلا قدم بھی اٹھایا جا چکا ہے

درخت اوّلیں انساں کی راہ دیکھتے ہیں
زمیں کو رہنے کے قابل بنایا جا چکا ہے

نتیجہ سامنے آ جائے گا کوئی دن میں
نئی کہانی کا خاکہ بنایا جا چکا ہے

نشستیں خالی کریں ناظرینِ نو کے لیے
کہ آپ کو تو تماشا دکھایا جا چکا ہے

سمجھ میں آئیں گی تحقیق سے کئی باتیں
دماغ تجربہ گاہوں میں لایا جا چکا ہے

بالآخر آ گیا اس کی لپیٹ میں سب کچھ
فنا کا دائرہ اتنا بڑھایا جا چکا ہے

ہمارے دن بھی ہمارے نہیں ہیں، راتیں بھی
ہمارے وقت پہ بھی غلبہ پایا جا چکا ہے

اندھیرے نے ہے دھما چوکڑی مچائی ہوئی
کرن کو لوریاں دے کر سلایا جا چکا ہے

کہیں سے اور مری واپسی نہیں ہونی
جہاں سے لوٹ کے آنا تھا، آیا جا چکا ہے

میں اور غالب اکٹھے بسر کریں جس کو
بلندیوں پہ وہ منظر بنایا جا چکا ہے

بغیر خاک بھی ممکن ہے اب نمو شاہد
کہ پہلا پھول خلا میں اُگایا جا چکا ہے

شاہد ماکلی

غزل

کتنا مشکل ہے خدا ہونا بھی
درد دینا بھی ، دوا ہونا بھی

ایک للکار ہے آندھی چلنا
اور للکار دیا ہونا بھی

نہیں آسان تمہارا ملنا
نہیں آسان جُدا ہونا بھی

عشق! بس تیری نشانی ٹھہرا
دل دھڑکنا بھی ، رُکا ہونا بھی

اِک قیامت پہ ٹلا ہے شاید
تیرے وعدے کا وفا ہونا بھی

بن گیا فخرِ جوازِ خلقت
ایک سجدے کا ادا ہونا بھی

شبہ طراز

غزل

کہا کسی نے بڑے کام کی اُداسی ہے
پکارا دل یہ اُسی نام کی اُداسی ہے

مرے مکان کے پیچھے ہے جُھنڈ پیڑوں کا
وہاں پہ دن کی نہیں، شام کی اُداسی ہے

ترے بغیر بھی آرام سے میں جیتا ہوں
بس اِن دنوں اِسی آرام کی اُداسی ہے

بُرا بھلا مرا آغاز ٹھیک تھا لیکن
میں فکرمند ہوں انجام کی اُداسی ہے

یہ آسمان کا جو رنگ زرد ہو گیا ہے
ترے بُجھے ہوئے پیغام کی اُداسی ہے

وہ اُس طرف ہے جو رونق ظہورؔ دیدنی ہے
مگر یہاں جو در و بام کی اُداسی ہے

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم نے جسے بے وفا کہا تھا
یہ کرب بھی ہم نے ہی سہا تھا

غزل

گہری جھیل، سمندر، بہتا دریا اچھا لگتا ہے
اس کی باتیں اس کا میٹھا لہجہ اچھا لگتا ہے

لوگوں کی اک بھیڑ میں اس کو آنکھیں ڈھونڈتی رہتی ہیں
سب چہروں میں اس کا ہنستا چہرا اچھا لگتا ہے

تم جب میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر چلتے ہو
دھوپ ہو چاہے چھاؤں چلتے رہنا اچھا لگتا ہے

مشکل میں اس کے لفظوں سے مجھ کو حوصلہ ملتا ہے
اس کا پیار سے مجھ کو اپنا کہنا اچھا لگتا ہے

باہر آ کر رات کے اندھے کمرے کی تاریکی سے
جلتا بجھتا جگنو روشن تارا اچھا لگتا ہے

وہ جو کچھ بھی پہنے وہ اس کی قامت پر جچتا ہے
اس کے کھلتے رنگ پہ کالا کرتا اچھا لگتا ہے

اشرف کمال

غزل

رخ پر کھلے گلاب الگ سے تھے
خوشبو تو تھی عذاب الگ سے تھے

سب نے سجا کے رکھے تھے آنکھوں میں
ہر ذہن میں سراب الگ سے تھے

کچھ تو سوال بھی تھے بہت مشکل
اور کچھ ترے جواب الگ سے تھے

جو مٹ گئے وہی تو نہ مٹ پائے
دل دنیا کے نصاب الگ سے تھے

جو ہم نے دیکھے تھے کبھی مل کر ساتھ
تعبیر اور خواب الگ سے تھے

سوچا مگر گناہ نہ کر پائے
اس کے مگر ثواب الگ سے تھے

مدت ہوئی وہ کچھ نہیں بولا تھا
چپ میں مگر عتاب الگ سے تھے

بشیر احمد حبیب

غزل

چراغ آندھی کے سامنے جوڑتا ہوا ہے
کہ اس لیے بھی تو کچھ اندھیرا چھٹا ہوا ہے

جو مجھ پہ تہمت لگا رہے ہیں انہیں بتاؤ
کہ میرا گرتہ تو پیٹھ پر سے پھٹا ہوا ہے

میں اس کو منزل پہ لے کے جانے کا سوچتا ہوں
وہ کارواں جو کہ اپنی رہ سے ہٹا ہوا ہے

تمہاری چالوں سے ہار جانے کا غم نہیں ہے
تمہارے طعنوں سے دل ہمارا پھٹا ہوا ہے

غبار سورج کو ڈھانپ لے گا تو کیا کرو گے
یہ گرد روکو کہ جس سے منظر اٹا ہوا ہے

ہمارے اپنے عدو کی صف میں کھڑے ہیں ارشدؔ
ہمارا لشکر یوں وسوسوں میں بٹا ہوا ہے

ارشد محمود ارشد

یہ لوگ مول چکائیں گے میرے بعد ترا
یہ خانہ زاد، مرے بھائیوں کے ساتھی ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غزل

زندگی زندگی میں ڈھلنے لگی
روشنی ساتھ ساتھ چلنے لگی

رات ٹھہری نہیں ہے رستے میں
وقت کی گرد باد چلنے لگی

اک کہانی ہے خواب کے اندر
غم کی صورت کہیں بہلنے لگی

آسماں پر تغیرات کی دھند
پھر زمیں رُخ کوئی بدلنے لگی

رات کی بے کنار وسعت میں
اک صدا پھر فغاں میں ڈھلنے لگی

دل کو تشکیک سے نکالے کوئی
جان میں بے کلی سنبھلنے لگی

آس پلکیں دھواں دھواں کیوں ہیں
زیست کیوں راستے بدلنے لگی

آسناتھ کنول

غزل

جو ایک بار بھی مجھ سے کبھی ملا نہیں تھا
سوائے اس کے مرا کوئی آشنا نہیں تھا

میں جی رہا تھا حیات و ممات کے مابین
فریبِ خواہشِ دنیا میں مبتلا نہیں تھا

میں جانتا ہوں پرستش نہیں ہوئی اس کی
اگرچہ عشق تھا لیکن مرا خدا نہیں تھا

سکوت توڑ کے رختِ سفر اُٹھا کے چلا
بیانِ مرگ مطالب سے ماورا نہیں تھا

ستم شعار نے دامن بھی تار تار کیا
ابھی تو چاک گریبان کا سلا نہیں تھا

بس ایک در پہ گزاری گئی حیات کہ اب
اک اور بار بچھڑنے کا حوصلہ نہیں تھا

یہ کیا ہوا ہے تجھے عابدی بتا تو سہی
تو اس قدر تو کبھی مشتعل رہا نہیں تھا

علی حسین عابدی

غزل

سنا رہا ہوں جو قصہ بہت پرانا ہے
مرے عزیز تمہارا نیا زمانہ ہے

دکھاؤں کیا کہ مکمل نہیں مکاں اپنا
بنا ہے آدھا اور آدھا ابھی بنانا ہے

جو سن رہی ہے یہ دنیا مری کہانی ہے
جو لکھ رہا ہے زمانہ مرا فسانہ ہے

تمہارے ہاتھ کی چائے سرور دیتی ہے
تمہارے ہاتھ کا کھانا عجیب کھانا ہے

اسی لئے میں زمان و مکاں نہیں رکھتا
مجھے خبر ہے یہ دنیا فریب خانہ ہے

علی کے لال کا اپنا مقام ہے بھائی
علی کے لال کا اپنا ہی آستانہ ہے

ہماری بات کو آگے کوئی بڑھائے گا
ہمارے بعد بھی انصر کسی نے آنا ہے

انصر حسن

غزل

اب تو سنتا ہی نہیں یار دہائی دل کی
پہلے کہتا تھا کہ ممکن ہے رہائی دل کی

مرے ہونٹوں کے دمکتے ہوئے چھالے دیکھو
میں نے ہونٹوں میں ذرا دیر، دبائی دل کی

اب وہ خوابوں پہ بھی اپنا ہی تسلط چاہے
جس کو بخشی تھی کبھی میں نے خدائی دل کی

اپنے جذبات کو شعروں میں پرو دیتا ہوں
خرچ کرتا ہوں میں ایسے بھی کمائی دل کی

ورنہ اس شخص کی آنکھیں بھی تو جا سکتی تھیں
میں نے حالت ہی نہیں اس کو دکھائی دل کی

اک تری یاد جو سینے سے نکلتی ہی نہیں
ورنہ کرتا ہوں میں ہر روز صفائی دل کی

چل کسی دشت یا صحرا کی طرف چلتے ہیں
بستی والوں نے بہت خاک اڑائی دل کی

میں نے ہر بار سماعت کے دریچے کھولے
اس نے پھر بھی نہ مجھے بات سنائی دل کی

روز کہتا ہوں کہ اب تجھ کو بھلا دوں شاہد
روز ہوتی ہے مرے ساتھ لڑائی دل کی

افتخار شاہد

غزل

جو مخفی ہیں دلوں کے حال اللہ جانتا ہے
بھلے ہیں یا برے اعمال اللہ جانتا ہے

گزاری اس طرح سے زندگی ہم عاصیوں نے
سخاوت کی محبت مال اللہ جانتا ہے

شکاری بے خبر مارے گئے حرفِ دعا سے
بچائے جس کسی نے جال اللہ جانتا ہے

اسے ناشاد ہی دیکھا ہمیشہ زندگی میں
چلی جس نے بھی الٹی چال اللہ جانتا ہے

بھروسہ اب نہیں دل کے مکینوں کا سکندر
رہے گا کون کتنے سال اللہ جانتا ہے

مرزا سکندر بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ٹھوکریں مارنے لگتا ہے لہو نس نس میں
کتنا دشوار ہے تیرا مرا یکجا ہونا

غزلیں

میں نے قسمت کو آزمایا تھا
وہ مری زندگی میں آیا تھا
میں نے اپنا سمجھ لیا تجھ کو
تو جو اپنا نہیں پرایا تھا
اس کے دل میں تھا کوئی پہلے سے
جس کسی سے بھی دل لگایا تھا
ساتھ تیرے رہا جو برسوں سے
میں نہیں تھا وہ میرا سایہ تھا
خواب میں اک خیال تھا شاید
اس نے جیسے گلے لگایا تھا

میرے آنگن میں پھول کھلتے گئے
وہ جو بھولے سے مسکرایا تھا
روشنی میں جو میرے ساتھ رہا
میں تھا، تو تھا یا میرا سایہ تھا
وہ تصور تھا یا کوئی تصویر
تیرے آنے پہ کون آیا تھا؟
وقت ساکت، مقام بھی ساکت
حسن نے معجزہ دکھایا تھا

راجہ عبدالقیوم

جھلملاتے تاروں میں لپٹی ہوئی لیلائے شب
جانے کب سے اس طرح کا ایک پیکر دل میں ہے

نیلگوں سی جھیل میں نیلا ہے عکسِ آسماں
ایک منظر آنکھ میں ہے ایک منظر دل میں ہے

حادثے اتنے ہوئے محسوس کچھ ہوتا نہیں
ایسے لگتا ہے کہ جیسے سنگِ مرمر دل میں ہے

اُلجھنیں، اندیشے، خدشے، وسوسے ہیں اس قدر
دل ضرور اک اور اس دل کے برابر دل میں ہے

ایک حُسنِ بے کراں ہے، اک ادائے بے بہا
اک تصور، ہر تصور سے جو برتر، دل میں ہے

دل گیا پر آپ دل سے جا نہ پائیں گے کبھی
یادِ ماضی، فکرِ فردا سے بھی بڑھ کر دل میں ہے

غزل

اُس کے دل نے بھی کچھ کہا ہو گا
غیر نے جو کہا سنا ہو گا

کچھ نہ کچھ سوچ کر ہی پلٹا ہے
گھر سے کچھ ٹھان کر چلا ہو گا

آنے پہ جس کے ہو گا ہنگامہ
وہ نہیں آیا پھر تو کیا ہو گا

اس پہ سکتہ ہوا ہے جو طاری
کچھ نہ کچھ تو اُسے دِکھا ہو گا

سارے ششدر ہیں دیکھ کر اُن کو
کام ایسا کوئی ہُوا ہو گا

ٹوٹے دل سے نکل گیا گھر سے
کیا خبر وہ کہاں گیا ہو گا

کرب چہرے پہ اُس کے طاری ہے
کوئی فاروقؔ دل جلا ہو گا

زبیر فاروق

غزل

ہوتے ہی ذرا عشق کے آثار برآمد
آلام کے ہونے لگے انبار برآمد

ہائے تیرے وعدوں کے جرائم پہ میں صدقے
اقرار برآمد کبھی انکار برآمد

یوں اُٹھے تصور ترا ویرانۂ دل میں
جیسے ہو کوئی اسپِ سُبک سار برآمد

اے بُت شکنو توڑ ہی ڈالو تو ہے اچھا
اور کرلو مرے بُت سے مرا یار برآمد

اک پل کے لیے آئی نظر ایک جھلک سی
چلمن سے ہوئی حُسن کی رفتار برآمد

جب سوچا کبھی ترکِ تعلق کا تو صاحب
سینے سے ہوا ہے دلِ عیّار برآمد

کب روتی ہوئی آنکھوں پہ رکھو گے دلاسہ
ہو جائے گا جب چشمۂ خونبار برآمد

فیصلؔ نے غزل لکھی ہے رومی کی زمیں پر
اور خوب کیے ہیں کئی اشعار برآمد

جلتے ہوئے سورج کے تلے آئی تری یاد
ہوتے ہوئے دیکھے کئی اشجار برآمد

آئے تھے مری خانہ تلاشی کے لیے وہ
اور کرکے گئے ہیں کئی آزار برآمد

جس دشت میں صیّاد کا قبضہ ہو وہاں پر
ہوتا ہے کہاں آ ہوئے غمخوار برآمد

فیصل زمان چشتی

غزلیں

کہاں کی عاقبت اس کا ثمر لیا جائے
یہاں تو شام دیا اور سحر لیا جائے

بگڑتا کچھ بھی نہیں ایک بہتے دریا کا
پیالہ ایک اگر اس سے بھر لیا جائے

روش روش پہ گلابوں کا پیرہن دیکھیں
کسی بہانے اسے یاد کر لیا جائے

ہمارے قتل کا یہ کس نے اعتراف کیا
ہمیں طلب تھی کہ الزام سر لیا جائے

اٹھا اٹھا کے میں تھکنے لگا ہوں بارِ وجود
کسی فقیر کے کاسے میں بھر لیا جائے

جواز لطف و کرم کا نہیں تو مت کیجیے
گناہگار سمجھ کر ہی دھر لیا جائے

چٹکنے اور مہکنے کے دن نہیں جاذبؔ
بہار آئی ہے کچھ تو اثر لیا جائے

اکرم جاذب

میرے کپڑوں سے مہک جائے گی کچھ وقت کے بعد
یہ محبت کی کسک جائے گی کچھ وقت کے بعد

قحط کے دن بھی کسی طور گزر جائیں گے
فصل امید کی پک جائے گی کچھ وقت کے بعد

بس اسی دھن میں جلاتے ہیں چراغوں پہ چراغ
بادِ بے رحم بھی تھک جائے گی کچھ وقت کے بعد

سیر کرتے ہیں مضافات کی پگڈنڈیوں پر
شہر دل کو بھی سڑک جائے گی کچھ وقت کے بعد

برف کا اوڑھ کے رکھیں گے لبادہ کب تک
آگ سینے میں دہک جائے گی کچھ وقت کے بعد

دمِ آمد لبِ اظہار مقفل رہے گا
یہ صراحی بھی چھلک جائے گی کچھ وقت کے بعد

اپنی آواز میں احساس کی شدت بھی ملا
ہر سماعت میں دھمک جائے گی کچھ وقت کے بعد

یہ جو سورج کی رفاقت نے نمایاں کیے ہیں
دھند یہ عیب بھی ڈھک جائے گی کچھ وقت کے بعد

ہاتھ پہنچیں گے کبھی پکے ثمر پر جاذبؔ
اور ٹہنی بھی لچک جائے گی کچھ وقت کے بعد

غزل

پاس ہوکر بعید ہے گویا
ہم تو تھے منتظر نہیں آیا
چوٹ دل پر شدید ہے گویا
آ رہا تھا شنید ہے گویا

روز کرتے ہیں وہ ستم ایجاد
پاس ہوتا ہے جب تصور تو
ہر ادا ہی جدید ہے گویا
ایسی ساعت سعید ہے گویا

جس کی سوچوں کے گرد ہے پہرہ
فرد وہ زرخرید ہے گویا

تو بھلا اُس کو جو نہیں لوٹا
مشورہ یہ مفید ہے گویا

جس نے دم کرکے دل نکالا تھا
آنکھ اُس کی مرید ہے گویا

تیرے ہاتھوں میں ایک کاغذ ہے
تازہ غم کی رسید ہے گویا

باتوں باتوں میں جان نکلی تھی
تیغِ لب سے شہید ہے گویا

تصور اقبال

غزل [اختر عثمان کی نذر]

وصال کو ہے کوئی غیر اور دھیان کو میں
سو موم کر نہیں پایا کسی چٹان کو میں

کچھ اور دیر ہے خود ساختہ ہنسی کا بھرم
کچھ اور دیر ستاؤں گا اپنی جان کو میں

کوئی ستارہ مجھے مل نہیں سکا اب تک
ہزار چھان کے بیٹھا ہوں آسمان کو میں

ضروریات کا واحد علاج کہہ لیں مجھے
بہت عزیز ہوں اب اپنے خاندان کو میں

تجھے تو کوئی مصلیٰ بھی دینے والا نہیں
بچھا تو دوں ترے قدموں میں خاک دان کو میں

نعیم رضا بھٹی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گلشن کا دھوکا ہوتا ہے، سناٹوں کے شہر پر
گلی گلی پرتو ہے اس کی آہٹ کی مہکار کا

غزل

دیارِ شوق میں آئے تھے ایک خواب کے ساتھ
گزر رہی ہے مسلسل کسی عذاب کے ساتھ

ہم اہل درد پکارے گئے صحیفوں میں
ہم اہل عشق اتارے گئے کتاب کے ساتھ

پھر ایک شام پذیرائی چشم تر کی ہوئی
پھر ایک شام گزاری گئی جناب کے ساتھ

ہمیں یہ خوف اندھیرے نگل نہ جائیں کہیں
سو ہم نے جسم کو ڈھانپا ہے آفتاب کے ساتھ

ہوا نے سادھ لی چپ، رات نے دعا مانگی
ستارہ سہما رہا بجھتے آفتاب کے ساتھ

مکالمہ رہا جاری ہماری آنکھوں کا
بدن کی شاخ پہ کھلتے ہوئے گلاب کے ساتھ

کچھ اور چاہئے تشنہ لبی مٹانے کو
یہ پیاس وہ ہے جو بجھتی نہیں شراب کے ساتھ

زعیم وہ مری دریا دلی سے ڈرتا ہے
وہ مجھ سے ملتا ہے لیکن بڑے حساب کے ساتھ

زعیم رشید

غزل

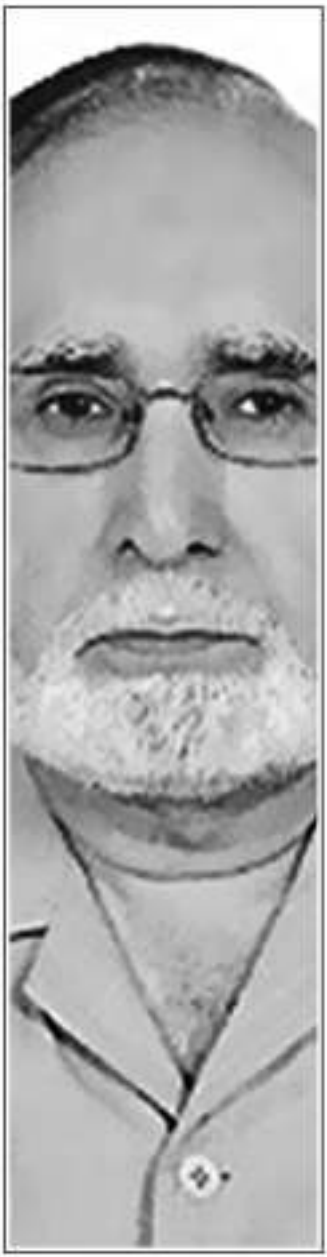

مجھ کو اب تک تُو نا سمجھا، تُف ہے اِس نادانی پر
حیرانی مجھ کو ہوتی ہے، تیری اِس حیرانی پر

بیچ میں دریا، کچّا مٹکا، ملنا کتنا مُشکل تھا
اُن کی روحیں کُوستی ہوں گی، آج کی ہر آسانی پر

تجھ کو روکا تھا ناں مت کر جھوٹے دعوے تقوے کے
پونچھ پسینہ جو آیا ہے اب تیری پیشانی پر

ہر اک دیکھو! شاکی ہے جانبازوں کی کمیابی کا
سب کے ہونٹوں پر ہے تالا جاں کی اس ارزانی پر

عامل بن کر عزت لُوٹیں، حاکم بن کر سب کچھ ہی
لعنت ایسی درویشی پر، تُف ایسی سلطانی پر

آؤ اپنے دکھ سکھ بانٹیں، اِک دوجے کی بات سنیں
اتنا تو احسان کریں ہم اب نسلِ انسانی پر

اِک دولت تھی تیری یادیں، وہ بھی گھٹتی جاتی ہے
اب تُو ہنس لے جتنا چاہے میری بے سامانی پر

بارش کی تم قدر و قیمت، جاؤ پوچھو دہقاں سے
جس کے بچوں کی نظریں ہیں چار ایکڑ بارانی پر

سید ضیا حسین

غزل

مکمل رابطے میں آ گیا ہوں
تمہارے راستے میں آ گیا ہوں

میں خود پر کھل رہا ہوں دھیرے دھیرے
تمہارے آئینے میں آ گیا ہوں

کسی کے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا
میں اپنے زائچے میں آ گیا ہوں

سفر کرنا ضروری بھی نہیں تھا
میں یونہی قافلے میں آ گیا ہوں

مری جانب اشارے ہو رہے ہیں
اچانک تذکرے میں آ گیا ہوں

میں پورا واقعہ تھا داستاں کا
سمٹ کر حاشیے میں آ گیا ہوں

عاصم اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بس اک آواز پر تو لوٹ آتا
کسی کے پاس یہ جادو نہیں تھا

غزل

جو تاثیر سے خالی ہے
شاعری نہیں جگالی ہے

رام زمانہ کر لے گا
اس کی خام خیالی ہے

میں نے اس کے وعدوں سے
پھر اک رات سجا لی ہے

منظر ہے ویران پڑا
آنکھوں میں ہریالی ہے

دل کی جانے صرف خدا
صورت تو متوالی ہے

آپ سنبھل کے بیٹھو یار!
میں نے آنکھ ہٹا لی ہے

اس نے آنکھوں آنکھوں میں
بات ہر اک منوا لی ہے

آخر ناگ بنی ہے دوست!
جو بھی خواہش پالی ہے

پہروں سوئے رہے ہیں ہم
آنکھ میں پھر بھی لالی ہے

اس نے میرے اندر سے
کوئی چیز چرا لی ہے

یاد کہیں رکھ بیٹھی تھی
ہر اک چیز کھنگالی ہے

عنبرین خان

غزل

مانا کہ نہیں آج طرف دار ہماری
دنیا کبھی ہوتی تھی پرستار ہماری

افسوس تو یہ ہے کہ دلاسہ نہیں دیتا
وہ بات تو سنتا ہے کئی بار ہماری

ظالم کے لیے نرم رویہ نہیں رکھتے
مظلوم پہ چلتی نہیں تلوار ہماری

ٹوٹے ہوئے رشتوں کی بحالی کے لیے تھی
جتنی بھی ہوئی آپ سے تکرار ہماری

ہر ایک سے بیعت کا تقاضا نہیں کرتے
تعداد سے بنتی نہیں سرکار ہماری

ہم لوگ اگر آ ہی گئے ہیں سرِ بازار
قیمت نہ گرا چشمِ خریدار ہماری

ازور شیرازی

غزل

فضا میں تیرتے اڑتے پرندے
مجھے اچھے لگے سارے پرندے

کہانی ظلم کی دہرا رہے ہیں
زبان حال سے ننھے پرندے

ہوا کے دوش پر یوں اڑ رہے ہیں
ہوں جیسے برف کے گالے پرندے

بہاروں کے پلٹتے ہی چمن میں
چہکنے لگ گئے سہمے پرندے

نیا ملبوس بدلا ہر شجر نے
مگر اب تک نہیں بدلے پرندے

نہ جانے کونسی سوچوں میں گم ہیں
بریدہ شاخ پر بیٹھے پرندے

چھپے بیٹھے ہیں اپنے گھونسلوں میں
ابھی تک خوف کے مارے پرندے

پلٹ ہی آئیں گے اعجاز دانش
اگر رستہ نہیں بھولے پرندے

اعجاز دانش

غزل

سیم و زر کی کوئی تنویر نہیں چاہتی میں
کسی شہزادی سی تقدیر نہیں چاہتی میں

مکتبِ عشق سے وابستہ ہوں کافی ہے مجھے
دادِ غالب ، سندِ میر نہیں چاہتی میں

فیض یابی تری صحبت ہی سے ملتی ہے مجھے
کب ترے عشق کی تاثیر نہیں چاہتی میں

قید اب وصل کے زنداں میں تو کر لے مجھ کو
یہ ترے ہجر کی زنجیر نہیں چاہتی میں

مجھ کو اتنی بھی نہ سکھلا ٹونشانہ بازی
تجھ پہ چل جائے مرا تیر نہیں چاہتی میں

اب تو آتا نہیں عنبرؔ وہ کبھی سپنے میں
اب کسی خواب کی تعبیر نہیں چاہتی میں

نادیہ عنبر لودھی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

غزل

کچھ فائدے بھی ہوتے ہیں اجڑے مکان کے
الفاظ اس میں گونجتے ہیں رفتگان کے

اے چاند اس میں تیری بھی سازش ضرور ہے
تارے کدھر گئے ہیں مرے آسمان کے

اڑ جائے گا یقین کے پنجرے کو توڑ کر
تھوڑے سے پر نکلنے دو وہم و گمان کے

غزلیں مری بچا لو برے وقت کے لیے
الفاظ بیچ ڈالنا مجھ بے زبان کے

کربل کی ریت دیکھ کے اتنے تھے مطمئن
جیسے کہ منتظر ہوں اسی امتحان کے

اک بار میرے لفظوں کو پڑھ کر زبان سے
کردار زندہ کر دو مری داستان کے

کھیلے گا کب وہ پیار کی بازی ہمارے ساتھ
بیٹھے ہوئے تھے کب کے ہی ہم ہار مان کے

اتنا اثر تو رکھتی ہے ماں کی دعا علی
دیکھے ہیں میں نے کھلتے کواڑ آسمان کے

علی رضا بلوچ

غزلیں

اس زندگی میں کل نہیں اک لمحہ بھی جناب
آنکھیں ابھی کھلی نہ تھیں رخصت ہوا شباب

اک سمت دشتِ بے کراں اک سمت پھل کا باغ
یعنی کہ مرگ و زیست میں کرنا تھا انتخاب

دریائے دل میں کر گیا طوفان سا بپا
دیکھا تھا میں نے ایک دن اس چھت پہ ماہتاب

کوئی پڑھا سکا نہ جو اس نے پڑھا دیا
وا ہو گیا تھا ایک دن اِک چہرۂ کتاب

ہم کو ڈرا نہ شیخ تو میدانِ حشر سے
ایسا تو روز دیتے ہیں دنیا ہی میں حساب

دعویٰ ہے میرا خاک وہ ہو جائے مثلِ طور
جو آنکھ بھر کے دیکھ لے کس میں ہے اتنی تاب

فرہاد و مجنوں کھپ گئے میدانِ عشق میں
بچوں کا اس میں کام کیا گھر جائیے شہابؔ

شہاب اللہ شہاب

ملیں جو ہمسفر تو حوصلے فولاد بھی ہوں گے
رکھیں جو شاد وہ تم کو تو خود دلشاد بھی ہوں گے

یہ جو حالات بگڑے ہیں ہمارا امتحاں ہے یہ
ہمارے دن بھی پھر جائیں گے ہم آباد بھی ہوں گے

ہمیں پختہ یقیں ہے دوریاں مٹ جائیں گی ہمدم!
تجھے پا کر کسی دن ہم بہت ہی شاد بھی ہوں گے

ابھی تو سوچ پر تالے پڑے ہیں، عقل پر پردے
مگر یہ لوگ سمجھیں گے، یہی آزاد بھی ہوں گے

ذرا سن لے! یہ دنیا ہے مکافاتِ عمل کی جا
ہمیں برباد کرتے ہیں جو خود برباد بھی ہوں گے

وہی جو یاد کرتے تھے مسلسل ہم کو بچپن میں
انہی کو آج تک کیا اس طرح ہم یاد بھی ہوں گے

شہابؔ اترا و مت شاعر نہیں بس ایک تم اچھے
کہیں تم سے بہت بہتر یہاں افراد بھی ہوں گے

غزل

ٹھیک ہے، کام بہت سے ہیں ذہیں کر سکتے
آتش عشق مگر سرد نہیں کر سکتے

کاش! تیار کہیں ایسی زمیں کر سکتے
آسماں زاد! جہاں ظلم نہیں کر سکتے

اوّلیں عشق نے وہ کام دِکھایا ہے کہ اب
آپ تو آپ، نہیں خود پہ یقیں کر سکتے

وقت ایسا بھی محبت پہ نہیں آنا تھا
آپ اگر بات مِری ذہن نشیں کر سکتے

صِرف تیرے لیے اس شہر میں آئے ہوئے ہم
صِرف ملنے پہ گزارا تو نہیں کر سکتے

مر بھی جاتے تو نہیں جاتے یہاں سے انجم
حُجرۂ دل میں اگر آپ مکیں کر سکتے

امتیاز انجم

غزلیں

دیر تک میں نے بھی دیکھا اسے حیرانی سے
آج اک شخص ملا اتنی پشیمانی سے

اس قدر ہجر کی دولت سے نوازا اس نے
میں نے اک عمر گزاری بڑی آسانی سے

میں نے یہ سوچ کے اظہار محبت نہ کیا
ڈر نہ جائے وہ کہیں لفظوں کی عریانی سے

اس پہ واجب ہے کہ ہر پل وہ کرے شکر ادا
جس کو ہر لمحہ محبت ملے ارزانی سے

اے حسیں شخص ترے حق میں یہی بہتر ہے
بھول جائے تو محبت مری آسانی سے

میں نے جس جس سے بھی پوچھا ہے، یہی کہتا ہے
کم نہیں دل بھی کسی تختِ سلیمانی سے

محمد علی ایاز

آنکھ میں نم نہ رہے گریہ وزاری جائے
ایسی تصویر کوئی دل میں اتاری جائے

بال بکھرائے جو تو نے تو خیال آیا مجھے
زندگی زلف کے سائے میں گزاری جائے

ہم نے مانا کہ یہ آسودگی قسمت میں نہیں
پھر بھی تقدیر کسی طور سنواری جائے

زندگی جتنی بھی باقی ہے ترے رسوا کی
سانس در سانس ترے ہجر پہ واری جائے

میں قبیلے کے رواجوں کا بھرم توڑ چکا
اب یہ دستار مرے سر سے اتاری جائے

عالمگیر ہراج

غزل

گو خفا ہے مگر ملا تو سہی
ربط اس سے کوئی بنا تو سہی

میں تجھے آنکھ میں چھپا لوں گی
تو کبھی خواب بن کے آ تو سہی

کیا ہے تعبیر، ڈھونڈ لوں گی خود
خواب کوئی مجھے دکھا تو سہی

ضد نہیں ہے یہ روٹھنا میرا
مان جاؤں گی تو منا تو سہی

کیسی لگتی ہے تیرے ہونٹوں پر
یہ غزل تو بھی گنگنا تو سہی

وار دوں گی حیات میں تجھ پر
تو کسی روز آزما تو سہی

شفقت حیات شفق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پتھر ہوں، مجھ کو بھی رتبہ، مل جائے شہکار کا
شرط، کہ ضرب لگائے تیشہ، دنیا سے فنکار کا

غزلیں

بحرِ الفت کا ، اک کنارہ ہو
اور تری یاد کا سہارا ہو

تن بدن خوشبوؤں سے ہو مہکا
عکس کو آنکھ میں اتارا ہو

دو گھڑی چین دل کو آ جائے
خواہشوں کا بھی کچھ گزارا ہو

شاملِ حال کر لیا جائے!
جو بھی لمحہ ملے، تمہارا ہو

آنکھ تب تک نہ کھل سکے کوکی!
جب تلک گل! ملن ہمارا ہو

کوکی گل

مان بہت ہے جن پر مجھ کو، مار نہ دے ان ہاتھوں سے
اکثر یہ محسوس مجھے ہوتا ہے اس کی باتوں سے

پانچ منٹ میں اس نے کچلا، پیار بڑی بے دردی سے
پندرہ سال میں جس کے جوتے چمکاتی تھی ہاتھوں سے

سات دنوں میں ایک سا موسم، ایک سے سورج، تارے، چاند
پر وہ جس دن ہنس کے بولے، وہ دن اچھا ساتوں سے

ہار گئے لا لا کر پانی بادل اک دن آخر کار!
روتے روتے میری آنکھیں جیت گئیں برساتوں سے

آدھے خواب ادھوری باتیں لے کے تکتا آدھی رات
ناز تمہاری سنگت کیا ہے آدھے چاند کی راتوں سے

نازیہ شکور ناز

غزل

مجھے سمجھنے کا ہے جو دعویٰ تو یہ بتاؤ کہ کیا ہوا ہے
ہے آنکھ نم کیوں یہ دل ہے غمگیں فضا بھی جیسے خفا خفا ہے

ہے دل کا عالم دھواں دھواں سا پلک پلک پر ہیں خواب اٹکے
یہ شام اتری ہے کیسی گھر میں دیا جلا ہے نہ در کھلا ہے

میں سر جھکائے کھڑی ہوں کب سے ہے دور تک بس وہی اندھیرا
مرا مقدر ہے یہ سیاہی نہ صبح جاگی نہ دن چڑھا ہے

یوں تم نہ حیرت سے مجھ کو دیکھو یقین مانو کہ سچ یہی ہے
گیا جو اک بار کب ہے لوٹا یہی ہے دیکھا یہی سنا ہے

نہ راستوں پر گلاب مہکے نہ سایہ کرنے سحاب آئے
کہ یونہی کانٹوں پہ چلتے چلتے یہ زندگی کا سفر کٹا ہے

ہوا نے دی تھی یہی بشارت گھڑی دعا کی یہی تھی شائد
ترے تسلط سے جان نکلی تو پھر ہی اذن سفر ملا ہے

نائیلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

درد بھی موج کے مانند سفر کرتے ہیں
اچھا رہتا ہے پلک پر کوئی تارا ہونا

غزل

درد سے آشنائی دیتی ہے
گر محبت رہائی دیتی ہے

کتنی مشکل ہے زندگی میری
کتنی آساں دکھائی دیتی ہے

عشق میں آئنے کو یہ دنیا
یاس کی روشنائی دیتی ہے

موت خاکے میں زندگانی کے
رنگ بھرتی سجھائی دیتی ہے

چاند تارے تو خوب روشن ہیں
رات پھر کیوں دہائی دیتی ہے

ایک آواز دی گئی تھی مجھے
گونج اب تک سنائی دیتی ہے

رخسانہ سمن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیسی ٹھنڈی ہوا چلی خالد
چاند کیا ، جل بجھے ستارے بھی

غزل

دکھ کی دنیا میں کب نویلی ہوں
کوئی آکر بسا نہیں جس میں
زہر کے آس پاس کھیلی ہوں
میں وہ سنسان سی حویلی ہوں

ماں! لحد سے نکل کے گھر آجا
سختیاں خود پہ دنیا والوں کی
میں اکیلی، بہت اکیلی ہوں
اپنی ہمت سے بڑھ کے جھیلی ہوں

مجھ کو بانہوں میں بھر لے تنہائی
بوجھ پایا نہیں جسے کوئی
آج سے میں تری سہیلی ہوں
نادیہ میں تو وہ پہیلی ہوں

درد بچپن سے ساتھ ہے میرے
درد کی گود ہی میں کھیلی ہوں

خوش نصیبی کہیں نہیں ہے جہاں
بدنصیبی کی وہ ہتھیلی ہوں

خار دنیا سمجھ رہی ہے مجھے
اپنے بابا کی تو چنبیلی ہوں

زندگی کھیلتی رہی مجھ سے
اور میں زندگی سے کھیلی ہوں

نادیہ سحر

غزل

اک چوک کشادہ ہو رہا ہے
اک پیڑ گرا دیا گیا ہے

مَیں اتنا برا کبھی نہیں تھا
وہ جتنا تمھیں بتا گیا ہے

کچھ میرے معاملے غلط تھے
کچھ وقت نے سر پھرا دیا ہے

مَیں ٹھیک ہوں، جو ہوں جس جگہ ہوں
کیوں پوچھ رہے ہو، کیا ہوا ہے

کس لے میں اُسے پکارتے ہو!
وہ کون تمھارا آشنا ہے

دریا میں گرا کے پھول، کوئی
بند آنکھوں کسی کو ڈھونڈتا ہے

مَیں وہ ہوں کہ جس کو گھوم پھر کر
جنگل نے راستہ دیا ہے

لے دے کے یہی نوید صادق
دو چار برس کا ماجرا ہے

نوید صادق

غزل

میرے قدموں کو کوئی رستہ بلاتا رہ گیا
میں خدا معلوم کس دُنیا میں بیٹھا رہ گیا

رات بھر پھر خواب میں احباب سے محفل رہی
صبح دم میں پھر اکیلے کا اکیلا رہ گیا

شہر سے خود آشنائی کی روایت اُٹھ گئی
آئنہ دیوارِ تنہائی پہ لٹکا رہ گیا

ایک دُنیا پھول دینے پر اُسے مامور تھی
یوں بھی اُس کی راہ سے میں خار چُنتا رہ گیا

اِک ضروری بات کہنا تھی مجھے اُس سے کنورؔ
اب مجھے اُس سے فقط اتنا ہی کہنا رہ گیا

کنور امتیاز احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ایک دلِ نابینا کر لے ، خوشبو کا دیدار
کاش وہ یہ آنکھیں ٹھہرا لیں ، اپنی راہ گزار

غزل

میں انکشاف کروں گا اگر سوال ہوا
کہ راز رکھنا میرے واسطے وبال ہوا

نہ دیکھنے دیا خود کو ضرورتوں نے مجھے
ابھی تو سُر ہوں کسی کا کسی کی تال ہوا

کرے گا وقت یہ ثابت میں کتنا سُر میں ہوں
ابھی تو لوگوں کا سُر ہوں کسی کی تال ہوا

تمھارا چھونا میری روح کی شفا ٹھہرا
تمھارے دیکھے سے زخموں کا اندمال ہوا

میں ایسے قریۂ ساکت میں آ بسا اعجازؔ
مجھے عروج ملا نا کبھی زوال ہوا

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ عہد ایک مسیحا نفس میں زندہ تھا
رہا نہ وہ بھی سلامت، بکھر گئے ہم بھی

دیوار

نومتحد جرمن شہر برلن کے برینڈن برگ گیٹ پر اس دن عجب میلے کا سا سماں تھا۔ مشرقی اور مغربی جرمنی کا اتحاد اسی سال موسمِ خزاں میں تو ہوا تھا۔ ہم اس وقت شہر کی مشرقی جانب کھڑے تھے یا مغربی؟ میں اپنے کم گو جرمن نژاد ہم۔ کار ہیرشمٹ سے پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر پھر ایک تو یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ کیا فرق پڑتا ہے اب تو یہ ایک ہی ملک اور ایک ہی شہر ہے اور دوسرے یہ کہ میں اپنے ساتھی کو یہ تاثر کیوں دوں کہ میں اُس سے کم جانتا ہوں یا وہ مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں یونانی طرز پر تعمیر کیا جانے والا چھ بلند محرابی ستونوں پہ استوار چھبیس میٹر اونچا اور ساڑھے پینسٹھ میٹر چوڑا برینڈن برگ گیٹ ہمیشہ سے اس تاریخی شہر کی پہچان رہا ہے۔ قدیم برلن کا یہ داخلی دروازہ جس نے کئی تاریخی المیے سہے اور جو ۱۹۶۱ سے ۱۹۹۸ تک برلن اور جرمنی کی تقسیم کی یاد دلاتا رہا تھا اب جرمن اتحاد کی علامت پر اِترا رہا تھا۔ گیٹ کے اوپر رتھ پر سوار امن کی دیوی جانیاب کہاں اُڑنے کو پر تول رہی تھی۔

میں ہیرشمٹ کے ساتھ ایک تقریب میں شرکت اور کچھ اہم ثقافتی انٹرویوز کرنے کے لیے برلن آیا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر شہر کے اہم مقامات دیکھنے کا موقع بھی مل گیا تھا۔ ہیرشمٹ نے میرا ساتھ دینے کی ٹھانی۔ ہم نے ایک ہی دن میں چھ عجائب گھروں پر مشتمل 'عجائب گھروں کا جزیرہ' دیکھا۔ وہاں ایک اسلامی میوزیم بھی تھا جس میں مغل دور کے بہت سے نوادرات موجود تھے۔ سامنے کی دیوار پر ہاتھ سے بنا ایک رنگ دار قدیم نقشہ آویزاں تھا جس میں دریائے راوی اور شہر لاہور صاف دکھائی دیتے تھے۔ میں نے اس نقشے کی تصویر اپنے کیمرے میں محفوظ کر لی تھی۔ پھر برلن کا

حامد یزدانی

مشہور کلیسا 'برلنر ڈوم' دیکھا جس کا گنبد دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ شہر کی مشرقی جانب سورج کی روشنی اور سائے سے دنیا بھر کے اوقات بتانے والی گھڑی بغیر ٹِک ٹِک کے گھوم رہی تھی۔ پھر دریا کی سیر کی۔ مشرقی حصے میں کمیونزم کی علامتوں کو ختم کیے جانے کا سلسلہ دیکھا۔ لینن کے سرخی مائل پتھر سے بنے قدِ آدم مجسمے کو اکھاڑ کر ایک کھلی گاڑی میں کسی ان جان مقام پر منتقل کیا جا رہا تھا۔ کہاں؟ میں نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ پھر ہم نے ایک اطالوی ریستوران سے ٹونا مچھلی والا پیزا کھایا۔ اس سب کے بعد اب ہم برلن کے اہم ترین تاریخی مقام یعنی برینڈن برگ گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔

اس سڑک پر ٹریفک نہ تھی۔ لوگ بس پیدل ہی آ جا رہے تھے یا کہہ لیجیے کہ گھوم پھر رہے تھے۔ کوئی گٹار بجا رہا تھا اور کوئی دھاتی ڈھول پیٹ رہا تھا۔ کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں شاید اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے رولر بلیڈز کے کرتب دکھاتے ہوئے فٹ پاتھ اور سڑک پر اچھل کود کر رہے تھے۔ جشن کے بعد کا ماحول تھا۔ سرکاری تقریبات تو کب کی ختم ہو چکی تھیں۔ اب تو عوامی سلسلہ چل رہا تھا۔ سب پرجوش اور خوش دکھائی دیتے تھے۔

فٹ پاتھ پر یہاں وہاں لوگوں نے سووینئرز کی اور یادگاری تحائف کی فرشی دکانیں سی سجا رکھی تھیں جن میں دیگر اشیاء کے ساتھ دیوارِ برلن کے رنگین ٹکڑے بھی رکھے تھے۔ کنکریٹ کے چھوٹے بڑے رنگین ٹکڑے۔ کچھ پلاسٹک کی تھیلیوں میں بند اور کچھ شیشے کے ڈبوں میں۔ ان میں سیاحوں کی دلچسپی دیکھنے کے لائق تھی۔ ایک ایسی ہی سرِ راہ سجی دکان میں سامان بیچنے والا نوجوان سیاحوں کو دیوار کے ٹکڑے دکھا کر کچھ بتا رہا تھا یا شاید کچھ سمجھا رہا تھا۔ سر اور ہاتھ ہلا ہلا کر۔ چلتے چلتے ہم بھی پاس پہونچ گئے۔

میں نے دیکھا کہ بائیس چوبیس سال کے اس خوش شکل نوجوان نے سامنے پلاسٹک کا زرد چوکور ٹکڑا بچھا رکھا تھا جس پر دیوارِ برلن کے بارہ ٹکڑے رکھے تھے۔ میں ابھی ان ٹکڑوں کو دور ہی سے دیکھ رہا تھا کہ ہیرشٹ نے ایک ٹکڑا خرید بھی لیا، پانچ مارک میں۔ ٹکڑا انہوں نے احتیاط سے اپنے دستی تھیلے میں رکھا اور پھر مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے۔ شاید دیکھنا چاہتے ہوں کہ تیسری دنیا کا یہ 'غریب باشندہ' جرمن دیوار کے لیے پیسے خرچ کرے گا یا نہیں؟ شاید ان کے مسکرانے کا یہ مقصد نہ ہو بلکہ کچھ اور ہو جیسے خوب صورت ترین ٹکڑا خرید لینے کی مسرت یا شاید وہ یونہی مسکرا رہے ہوں۔ شاید—

"آپ کتنے ٹکڑے ملنا مانگیں

گے؟"۔ دکان والے لڑکے کی ٹوٹی پھوٹی جرمن نے میری بے تکی سوچ کو بھی منقطع کر دیا تھا۔

"آپ کتنے ٹکڑے لینا چاہیں گے؟" میں نے جرمن زبان میں درستی کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس کی مسکراتی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے اردو میں پوچھا:

"پاکستان سے ہو کیا؟"

مجھے مصروف دیکھ کر ہیر شٹ ٹہلتے ہوئے ساتھ والی فرشی دکان کی طرف قدم بڑھا گئے تھے۔

"جی، جی — اور آپ بھی؟ ظاہر ہے آپ بھی وہیں سے ہیں، میں جان گیا سر جی۔ سارٹ ہوں میں۔" دائیں ہاتھ سے کچھ بھورے، کچھ سنہری سے بال ماتھے سے ہٹاتے ہوئے اس نے کہا۔

"تمہارے بالوں کا یہ ملا جلا رنگ دل چسپ ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"میرے اصل بال تو ویسے بھورے ہی ہیں۔ یہاں آ کر انہیں تھوڑا گولڈن کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ جرمنوں جیسا نظر آؤں۔ جتنا ان کے قریب ہوں گے اتنا ہی جلدی قبول کر لیے جائیں گے۔ نہیں کیا؟ وہ کہتے ہیں نا جیسا دیس ویسا بھیس۔ آپ بھی تو پورے گورے ہی لگتے ہیں سر جی۔ اور پھر آپ کی تو جرمن بھی اچھی ہے۔ ماشاءاللہ۔"

"شکریہ، تم باتیں خوب کر لیتے ہو۔" میں نے اپنی تعریف پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"جی بس اللہ کا کرم ہے۔ سر جی، آپ کب سے ہیں یہاں؟ اتنی اچھی زبان کیسے سیکھی؟ ضرور آپ کی گرل فرینڈ یا بیوی جرمن رہی ہوگی! سنا ہے ایسے زبان سیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور شہریت حاصل کرنا بھی۔ ہم بھی تلاش میں ہیں۔ سیاسی پناہ گزینوں کی زندگی آسان نہیں سر جی۔ ویسے سوئمنگ پول کی رکنیت بھی لی ہے۔ شاپنگ مال بھی جاتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گی۔ پہلوں کو ملی ہیں نا۔ تو آپ کیسے آئے تھے جرمنی؟" وہ تیز تیز بول رہا تھا۔ شاید کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ شاید وہ اپنی عادت کے مطابق ایسے بات کرتا ہو۔ شاید — لیکن میں خواہ مخواہ اندازے کیوں لگانا شروع کر دیتا ہوں۔ شاید اس لیے کہ —

"کیا سوچ رہے ہیں سر جی؟" اس کا سوال مجھے پھر واپس فٹ پاتھ کے یقین پر لے آیا تھا۔

"کچھ نہیں۔ ہاں میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میرا جرمنی آنے کا سفر خاصا غیر دل چسپ تھا۔ افسوس، اس پر کوئی سفر نامہ نہیں لکھا جا سکتا۔ لاہور سے کراچی پی آئی اے کے طیارے میں اور کراچی سے فرینکفرٹ جرمن ائرلائن

لف تھانزا کے جہاز میں۔ فرینکفرٹ سے براستہ ریل کولون۔ جرمن دوست ضرور ہیں میرے مگر بیوی پاکستانی ہے۔ مال شاپنگ کے لیے جانا پڑتا ہے اور سوئمنگ پول کی رکنیت میں نے لی نہیں۔ پانی سے میری بنتی نہیں۔ آپ پاکستان میں کہاں سے ہیں؟ پنڈی سے ---؟" میں نے اس کے سبھی سوالات کے جواب ترتیب وار دیتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں سر جی پنڈی سے نہیں میں تو ایبٹ آباد کے پاس ایک چھوٹے سے گاؤں بانڈی ڈوراں سے ہوں--- فضل نام ہے میرا"۔ وہ بولا

"بانڈی ڈوراں!؟" میں نے حیرت سے دوہرایا۔

"جی وہیں کا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کیا میرے گاؤں کو؟ کیسے جانتے ہیں آپ؟ وہ تو بالکل چھوٹا سا گاؤں ہے ایبٹ آباد سے ہٹ کر سکندر آباد سے اُوپر---" فضل جوش سے کہہ رہا تھا۔

"ہاں اوپر پہاڑی پر۔ ایک ہی ویگن ہے اوپر نیچے آنے جانے کے لیے۔ نیچے سڑک کے ساتھ ہی سرکاری ہسپتال کی عمارت اور اوپر گاؤں میں چند گھر، ایک سکول اور کچھ خالی جگہ۔ ہے نا؟" میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"مگر آپ تو---!"

"میں ایک تعلیمی دورے پر وہاں گیا تھا۔ ایک تحقیقی مقالہ لکھنا تھا جدت اور قدامت کے دوراہے پر کھڑے کسی علاقے پر۔ مجھے یاد ہے ایبٹ آباد میں مقامی میڈیکل کالج کے سامنے ایک یوتھ ہاسٹل میں ٹھہرے تھے ہم سب صوبائی یونی ورسٹی کے طلبا---"

"میرا خواب تھا جی میڈیکل کالج جانے کا جو پورا نہ ہو سکا۔ بس حالات ہی ایسے بنے کہ نکلنا پڑا سب کچھ بیچ میں چھوڑ چھاڑ کے۔ ایبٹ آباد تو خیر بہت مشہور شہر ہے۔"

"ہاں بالکل، دو ہفتے ہم وہاں ٹھہرے تھے۔ ایک روز ایبٹ آباد کے کسی بازار سے مشہور قسم کے چپلی کباب کھا کر ہم ائر مارشل اصغر خان سے ملنے کی خواہش لیے ان کی کوٹھی پر بھی گئے تھے مگر وہاں گیٹ پر بہت سے سپاہی تعینات تھے۔ ائر مارشل صاحب گھر پر نظر بند تھے اُن دنوں---"

"ریٹائرڈ ائر مارشل"۔ فضل نے جلدی سے میری درستی کی۔

"ہاں، ہاں، ریٹائرڈ ائر مارشل صاحب"۔ میں نے کھسیانا ہو کر کہا تھا۔ "خیر، ہم تو دور ہی سے واپس چلے آئے تھے۔ ڈر رہے تھے کہ پاس جانے پر کہیں دھر ہی نہ لیے جائیں۔ فوجی حکومت تھی بھائی۔ لیکن تم بہت بہادر ہو۔ اتنے ملکوں اور حکومتوں کو کامیابی سے چکمہ دیتے ہوئے اتنی دور آپہونچے۔"

"حالات بہادر بنا دیتے ہیں، سر جی۔ زندگی سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ یہ ٹکڑے ٹکڑے ہوئی دیوار جو آج میں زمیں پر رکھ کر بیچ رہا ہوں ایک دن اسے پار کرنے کے لیے اپنی جان پر کھیلنا پڑا تھا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"تو کیا تم نے ٹرین نہیں لی اِدھر آنے کے لیے!؟" میں نے پوچھا

"وہ ایجنٹ کا بچہ کئی روز کے سفر کے بعد ترکی اور مشرقی یورپ سے ہمیں کسی صورت مشرقی برلن تک لے آیا تھا۔ اور راستہ بھر تو یہی کہتا رہا تھا کہ بس اِدھر سے ایک سٹاپ سے ٹرین پر بیٹھو گے اور کچھ ہی دیر میں اُدھر مغربی سمت اتر جاؤ گے۔ وہاں پہونچتے ہی اپنے پاسپورٹ پھاڑ کر اسٹیشن کے واش روم میں بہا دینا اور باہر نکل کر سیاسی پناہ کی درخواست دے دینا۔ مگر وہ خبیث اچانک ہی غائب ہو گیا ہمیں چھوڑ کر۔ مشرقی یورپ کا باشندہ تھا وہ۔ شاید ہنگری کا یا شاید پولینڈ کا۔ یہ مشرقی یورپ کے لوگ بڑے فراڈ ہوتے ہیں سر جی۔ بس پھر کسی نہ کسی صورت شہر سے دور جا کر دیوار پھلانگنے کا منصوبہ بنایا۔ اتنی اونچی اور پکی دیوار! میرا دوست علی تو کہتا تھا کہ یہ ضرور جنات نے بنائی ہوگی۔ حالانکہ جنات نے تو دیوارِ چین بنائی تھی۔ گاؤں میں تو یہی سنتے تھے ہم۔"

میں اس کے بھولپن میں تصنع کی مقدار کو جانچ رہا تھا۔

"تو تم نے جنات کی بنائی دیوار اتنے آرام سے پھلانگ لی۔ تم تو بہت بہادر ہو بھئی ----" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"آرام سے کہاں سر جی۔ بڑی مشکل سے پار کی۔ ہمارے ایک ساتھی کو گولی بھی لگ گئی تھی۔ اس دیوار کے ٹکڑوں پر چمکتے رنگوں میں کسی کے خون کا رنگ بھی ہو سکتا ہے۔ اصل خون کا۔ دیوار کیا تھی سر جی۔ نری بدعا تھی کسی کی جو قبول ہو گئی تھی -- پر مجھے میری امی کی دعا لگ گئی تھی اس لیے میں بچ گیا اور میرے ساتھ میرے دو دوست بھی -- بس ہم بچ گئے۔ اللہ کا شکر ہے۔"

اب میں اس کی باتیں بھی سُن رہا تھا اور "ہُوں، ہُوں" کرتے ہوئے دیوارِ برلن کے ٹکڑوں کا جائزہ بھی لیتا جاتا تھا۔

"آپ کیا دیکھ رہے ہیں ان چیزوں کو؟ کچھ لیں گے کیا؟" اچانک اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں، میں سوچ رہا ہوں یہ دیوارِ برلن کا قدرے بڑا ٹکڑا --"

"کیا کریں گے آپ چھوڑے کی یہ نشانی خرید کر۔ چھوڑیں پرے، سر جی۔ یہ چھوڑے ڈالنے والی شے نہ ہی ساتھ لے جائیں تو اچھا ہے۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ تو ایک تاریخی شے ہے۔ ایک یادگار کے طور پر سجا کر رکھوں گا اس وچھوڑے کی نشانی کو۔" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔

"وچھوڑا تو دکھ دیتا ہے نا سر جی اور دکھ کی یاد دلانے والی نشانی رکھ کر دکھی کیوں ہونا، خواہ مخواہ۔" اس کے لہجے میں اداسی در آئی تھی۔ اپنوں سے دوری کے باعث اس کی اداسی کا سبب جاننا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ اس بار مجھے اپنی سوچ پر یقین تھا۔

"تو کیا تم سمجھتے ہو کہ جدائی کی یہ علامت جدائی ڈالنے کی کوئی پراسرار قوت رکھتی ہے؟" یہ کہتے ہوئے جانے کیوں بے ساختہ میری ہنسی نکل گئی تھی۔

"دیواریں تو ہمسائے کو ہمسائے سے دور ہی کرتی ہیں۔۔۔" وہ بولا تھا۔

"ایسا نہیں ہے، دیواریں حفاظت بھی تو کرتی ہیں۔ ہمیں حدود کا احساس بھی دلاتی ہیں۔"

"سر جی۔ یہاں کے بجائے اگر یہ دیوار برلن انڈیا اور پاکستان کے درمیان بنا دی جاتی تو کیسا رہتا؟ کیسا آئیڈیا ہے ویسے؟"

"ان دو پڑوسیوں کے درمیان تو پہلے ہی بہت تلخی بھرے فاصلے ہیں۔ سرحدیں بھی فاصلاتی دیواریں ہی تو ہیں۔"

"تو نہیں ہونی چاہئیں دیواریں؟"

"نہیں، میں یہ نہیں کہہ رہا۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ دیواریں اتنی اونچی نہیں ہونی چاہئیں کہ ہمسائے سے بچنے کے چکر میں ہم ہوا کے جھونکوں ہی سے محروم ہو جائیں"

"اب سمجھا۔ آپ دیوار تو چاہتے ہیں لیکن چھوٹی تاکہ ہمسائے سے سلام دعا بھی لے سکیں اور تازہ ہوا کے مزے بھی"۔

"رابرٹ فراسٹ کو پڑھا ہے تم نے؟ مشہور امریکی شاعر گزرا ہے۔ اس کی ایک نظم ہے 'مینڈنگ وال' ۔۔۔ دو ہمسایوں کی مشترکہ زمین پر بنی دیوار کو مرمت کرنے کی ضرورت کے بارے ہی میں ہے۔۔۔" میں کہتا چلا گیا تھا۔

"تو وہ امریکی شاعر صاحب بھی یہی کہتا ہے کہ دیواریں بنانی چاہئیں؟" اس نے معصومیت سے استفسار کیا تھا۔

"نہیں، وہ تو دیوار کو غیر ضروری سمجھتا ہے مگر اس کا ہمسایہ دیوار کو اچھی ہم سائیگی کی ضمانت قرار دیتا ہے۔"

"تو پھر نہیں بناتے وہ دیوار۔ ہے نا؟"

"نہیں، یہ اچھا ہم سایہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے اور اختلاف رائے کو بالائے طاق رکھ کر دیوار مرمت کرنے میں اس کی مدد کرتا ہے"۔

"تو اپنی بات منوا نہیں پاتا وہ اپنے ہم سائے سے۔ توڑا ہوا اس کا ہم سایہ۔"

"بعض اوقات اپنا موقف بتا دینا ہی کافی ہوتا۔ اختلاف ہوتے ہوئے بھی ہم مل کر چل سکتے ہیں۔ زبردستی بات منوانا ضروری نہیں ہوتا۔ اس کا ہم سایہ دیوار کے فائدے کا قائل تھا سو اس نے اس کی خواہش کا

احترام ضروری سمجھا---ویسے بھی نظم کو کئی ڈھنگ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اچھی تخلیق ایک سے زیادہ رنگ رکھتی ہے اور پھر---"

"رنگ سے میرا خیال اس ٹکڑے کی طرف چلا گیا ہے۔ یہ والا ٹکڑا لے لیں آپ دیوار کا۔ نیلا، سرخ اور ہلکا زرد--- دیکھیں رنگ اس میں بھی ڈھیروں ہیں"۔ اس نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ پیک کر دو۔ اور ہاں، مجھے دو ٹکڑے اور چاہئے ہوں گے اپنے دو دوستوں کے لیے۔ اگر یہ سفر سرکاری نہ ہوتا تو آج وہ دونوں میرے ساتھ ہی ہوتے یہاں۔ ہم اکٹھے ہی سیر و تفریح کرتے ہیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے کہ آپ کے دوست ہیں۔ بڑا سہارا ہو جاتا ہے ان کا۔ اکیلے بندے کی بھی کوئی زندگی ہے، سر جی!--- اور وہ بھی پردیس میں۔"

"یہ ملک میرے لیے پردیس نہیں۔ میں اس کا شہری ہوں۔ ٹیکس دیتا ہوں۔ اپنا گھر ہے، انتخابات میں ووٹ دینے کا حق رکھتا ہوں۔ البتہ یہ بات تم نے درست کہی کہ دوستوں کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ ان کے بغیر میں واقعی ادھورا سا محسوس کرتا ہوں۔"

"آپ کے وہ دوست جرمن ہیں کیا؟" اس نے شیشے کے چھوٹے سے کیس میں بند دیوارِ برلن کے ٹکڑے کو پلاسٹک کے تھیلے میں ڈالتے ہوئے اور پاس سے گزرتے ایک جوڑے کو سر کی جنبش سے 'آداب' کہتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ یہاں کے شہری نہیں۔ مہمان ورکرز ہیں۔ انہیں ویزے وغیرہ کی مشکل نہیں۔ کچھ سال سے یہیں ہیں۔ اپنے وطن آتے جاتے رہتے ہیں۔ بہت اچھے ہیں۔ بس فیملی ممبرز ہی کی طرح ہیں۔"

"تو اپنے ان دوستوں کے لیے چاہئیں آپ کو دو اور---! تو سر جی آپ یہ سفید اور مالٹے رنگ والا اور وہ ہرا اور بینگنی والا، میرا مطلب ہے سبز اور قرمزی والا۔ ٹھیک کہا نا میں نے؟ وہ دو لے لیں۔" فضل نے مزید دو ٹکڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ ٹکڑے کچھ زیادہ بڑے تو نہ تھے مگر رنگ دار خوب تھے۔ کچھ آدھے ادھورے ڈیزائن بنے ہوئے تھے۔ کسی گریفیٹی یا کسی نعرے کا حصہ رہے ہوں گے کبھی۔ اب ان کو بامعنی ہم نے خود بنانا تھا۔

"کیا انھیں شیشے کے کیس سے نکال کر دیکھ لوں؟" میں نے پوچھا

نہیں سر جی، بند ہی رہنے دیں ابھی انہیں۔" وہ منع کرتے ہوئے بولا

"اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن یہی والے کیوں؟" میں نے پوچھا

''سارے ٹکڑے تھوڑی اصلی ہوتے ہیں، سر جی! آپ تو میرے گرائیں میرا مطلب ہے میرے ہم وطن ہیں آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا''۔

فضل نے شرارت سے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب۔۔۔!؟''

''چھوٹا موٹا فن کار میں بھی ہوں، سر جی۔ پینٹر کا نہ سہی کار پینٹر کا بیٹا تو ہوں نا۔ رنگ ڈنگ کر لیتا ہوں کچھ میں بھی''۔

سپرے پینٹ کی بوتل دکھاتے ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنس دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا ہیرشمٹ نے مجھے آواز دی کہ گاڑی ہمیں لینے کو پہونچ چکی تھی۔ مجھے جلدی کرنا پڑی۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ کولون واپسی سے پہلے ہمیں ایک نیوز ایجنسی کے بیورو چیف سے بھی ملنا تھا۔ میں نے ان تین ٹکڑوں کے لیے پندرہ مارک ادا کیے اور یہ جانتے ہوئے کہ ہم پھر کبھی نہ ملیں گے پھر سے ملنے کی امید کے رسمی جملوں کا تبادلہ کرتے ہوئے ہیرشمٹ کی طرف بڑھ گیا۔

گاڑی کی طرف جاتے ہوئے ہیرشمٹ پوچھنے لگے:

''کیا باتیں ہوئیں اس نوجوان سے؟''

''ہم دنیا کی کچھ اہم دیواروں کے بارے میں بات کر رہے تھے۔'' میں نے بات گول مول کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اہم دیواروں کے بارے میں؟ تو ضرور یروشلم کی تاریخی دیوارِ گریہ کا ذکر بھی ہوا ہوگا۔ نہیں کیا؟'' ہیرشمٹ نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے، اس کا تو تذکرہ نہیں ہوا حال آں کہ میں جانتا ہوں کہ وہ دیوار بھی بہت اہم ہے۔ کوئی ایک سو ساٹھ فٹ طویل اور ساٹھ باسٹھ فٹ اونچی یہ دیوار بیت المقدس کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور تینوں بڑے مذاہب کو ماننے والوں کو عزیز ہے۔'' میں نے اپنی دلچسپی اور معلومات بکھیری تھیں۔

''طوالت اور بلندی سے زیادہ اہم اس کا تاریخی ہونا ہے اور پھر لوگوں کی عقیدت۔۔۔ میں نے یہودیوں کو آہ و بکا کرتے ہوئے بھی خود دیکھا ہے وہاں اور اس دیوار کے شگافوں میں اپنی دعاؤں کی پرچیاں ٹھونستے ہوئے بھی۔'' ہیرشمٹ نے کہا تھا۔

''آپ کو اس ثقافت سے خاصی دلچسپی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ اسی شوق میں آپ نے عبرانی زبان بھی تو سیکھی تھی۔'' میں نے کہا

''جی، ٹھیک کہا آپ نے۔ اسی لیے میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ آپ کے پاس دیوار کا جو بڑا ٹکڑا ہے اس پر عبرانی زبان کا ہی ایک لفظ لکھا ہوا ہے۔''

''واقعی!؟ میں تو سمجھا کوئی تجریدی فن کاری ہے یہ۔ کیا لکھا ہے یہ؟''

''گریہ۔۔۔!''

''کیا؟ عجیب بات ہے۔ یہاں تو تاریخی دیواریں مدغم ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی لگتا ہے۔ لیکن یہ بتائیں وہ لڑکا کچھ اصلی نقلی کی بات بھی کر رہا تھا۔ کچھ ایسے الفاظ میں نے سنے تھے۔ کیا کہہ رہا تھا وہ؟''۔

ہیرشٹ کو ایک تو ویسے ہی زبانیں سیکھنے کا شوق تھا دوسرے وہ کچھ عرصہ ہندوستان میں بھی رہ چکے تھے۔ اس لیے کچھ کچھ اردو ہندی سمجھ لیتے تھے۔

''وہ کہہ رہا تھا اس کے پاس دیوار کے سبھی ٹکڑے اصلی نہیں البتہ جو ٹکڑے اس نے مجھے دیئے ہیں وہ اصلی ہیں۔ اور یہ کہ میں اس کا ہم وطن ہوں اس لیے اس نے۔۔۔''

''خوب۔۔۔ تو وہ ہم جرمنوں کو بے وقوف بنانا جائز سمجھتا ہے۔ اس لیے آیا ہے وہ یہاں!؟۔'' انھوں نے اپنے ٹکڑے کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اور خفگی کے لہجہ میں کہا۔

''شاید وہ ہر خریدار کو ایسا ہی کچھ کہتا ہو اپنی دکانداری چمکانے کے لیے۔ ویسے بھی وہاں آپ کے علاوہ شاید ہی کوئی جرمن ہو۔ زیادہ تر تو سیاح تھے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے۔''

''پھر بھی وہ الو تو بنا رہا تھا!''

''کون سا کاروباری ہے جو پوری دیانت داری کا دعویٰ کر سکے!؟''

''پھر بھی۔۔۔ ہم جرمن بات اور وعدے کے پکے ہوتے ہیں۔''

''جی بے شک۔۔۔ اور پاکستانیوں میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ محنتی ہیں، مہمان نواز ہیں اور۔۔۔ اور پھر اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔'' میں نے اپنے لہجہ میں تلخی لائے بغیر دفاعی انداز میں کہا تھا۔ جانے کیوں میں نہیں چاہتا تھا کہ انھیں پتہ چلے کہ ان کی بات مجھے ناگوار گزری ہے۔

برلن سیوا پسی کا بیشتر سفر بس خاموشی سے گزر گیا۔

کولون پہونچ کر تاریخی دیوار برلن کا ایک یادگار رنگین ٹکڑا شیشے کے کیس سے نکال کر میں نے اپنے اپارٹمنٹ کے ڈرائنگ روم میں کارنس پر سجا لیا۔ اپنے فیملی فوٹو اور آئفل ٹاور کے دھاتی ماڈل کے عین درمیان۔ ویک اینڈ پر میرے دوست راؤ اور جوشی دونوں میرے ہاں آئے تو اس بار پر تکلف کھانے سے زیادہ انہیں کارنس پر رکھا دیوار برلن کا رنگین ٹکڑا پسند آیا۔ کھانا کھاتے اور چائے پیتے ہوئے میں نے انھیں سفر کی باتیں بھی سنائیں اور فضل سے اپنی گفتگو کی کچھ تفصیلات بھی۔ وہ خوب محظوظ ہوئے۔ بعد ازاں رخصت کرتے ہوئے جب میں نے انہیں شیشے میں بند دیوار کا ایک ایک ٹکڑا تحفتاً پیش کیا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھے تھے۔

ہم تینوں دوست کئی برس سے جرمنی میں اکٹھے تھے۔ کام پر بھی ایک ساتھ ہوتے اور جہاں تک ہو سکے، کام کے بعد بھی۔ یورپ بھر کی آوارہ گردی ہم نے مل کر کی۔ کئی ایسی مہمات اکٹھے سر کیں جنہیں کرنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہر سال ہی اپنے اپنے ملک جاتے تھے اور چھٹیاں گزار کر لوٹ آتے تھے اور میرے لیے وہاں سے نت نئے قصوں کہانیوں کی سوغاتیں لاتے۔

لیکن اب کے عجیب بات یہ ہوئی کہ ہماری اس ملاقات کے کچھ عرصہ بعد ہی پہلے جوشی اپنے ملک لوٹ گیا کیونکہ اس کے والد کے اچانک گزر جانے سے اس کے گھر والوں کو اس کی بہت ضرورت تھی۔ رہ گیا راؤ تو اس کے ساتھ یہ معاملہ بنا کہ اس بار اس کے ویزہ کی توسیع نہ ہو سکی کیونکہ جرمن اتحاد کے بعد مشرقی جرمنی کے شہریوں کو ملازمتیں دینے کی پالیسی پر عمل درآمد زوروں پر تھا۔ اور یوں راؤ بھی مستقلاً اپنے وطن سدھارا۔ میں ایک دم ہی تنہا ہو گیا۔ شب و روز کا رابطہ یوں دیکھتے ہی دیکھتے منقطع ہو گیا تھا کہ یقین ہی نہ آتا تھا۔ پھر ان سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی دھیرے دھیرے معدوم ہو گیا۔ شاید ان کے پتے بھی بدل گئے تھے۔ خاموشی آہستہ آہستہ پراسرار اور دبیز تر ہوتی چلی گئی۔

میں اپنے دل کو سمجھانے میں لگا رہتا تھا کہ ہم تینوں بچھڑ چکے ہیں۔ اپنے اپنے خطوں اور اپنی اپنی تنہائیوں میں قید ہو چکے ہیں۔ ایک شام ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھے جب میں نے کارنس کی طرف دیکھا تو مجھے صاف لگا کہ دیوار برلن کا رنگین ٹکڑا بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ برلن کو تقسیم کرنے والی فصیل اب ان دیکھے انداز میں میرے اور دوسروں کے درمیان وچھوڑے کی علامت بن کر حائل ہو رہی ہے۔ جیسے معمار جنات نے اسے برلن سے اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا ہو۔ کسی مقبول بددعا کی طرح۔

ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ ایسا ہوتا تو دنیا میں کتنے ہی لوگوں نے جو دیوار کے ٹکڑے لیے تھے ان سب کے مابین دیواریں حائل ہوتیں۔ شاید ہوں بھی۔ کیا واقعی!— نہیں نہیں ایسا کچھ ہوتا تو میرے یا میرے دوستوں کے ساتھ ہی کیوں ہوتا سب کے ساتھ ہوتا—

میں سوچ رہا تھا اور مسلسل بلند ہوتی دیوار پر بکھرے گریہ کے رنگوں میں مجھے اچانک فضل کا مسکراتا چہرا دکھائی دیا۔

"سارے ٹکڑے تھوڑی اصلی ہوتے ہیں، سر جی!"

وہ آنکھ مارتے ہوئے فن کارانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

ساتواں دھووَن

شاہین عباس

اَب جب بودی بابا اپنے بستر کو الگنی پر پھیلانے چھت پر جاتے تو دائیں بائیں کم ہی دیکھتے - ''شب بخیر'' والے دُہرے بچھونے کو تو جیسے تیسے اکہرا کرتے ہوئے دُھوپ میں ڈال ہی دیتے کہ گھاٹ کے کھائے پیے کو بیس تیس برس بعد بھی جب سر پر نتھارنے نچوڑنے لگتا تو دونوں ہاتھ کُہنیوں پر یُوں تن جاتے جیسے تکبیر کے لیے اُٹھے ہوں ؛ مگر رات بھر کی حلیف رضائی' دِن کے وقت زور آزمائی پر اُتر آتی- وہ ایک طرف سے رضائی کے دو کناروں کو مِلاتے تو یہ دُوسری طرف سے ڈھلک جاتی اَور اُن کے پیَروں تک لڑھکتی آتی- رُوئی کا پانچ سیر وزنی گولا، سامن کا باٹ بنا اُن کے قریب آ کر گرتا تو الگنی کی ایک کھُونٹی پر بیٹھی چڑیا اُڑ کر برساتی کی چھت پر چلی جاتی اَور دُوسری کھونٹی سے بندھا پرانا ازار بند جُھولنے لگتا' جیسے ایک دم بودی بابا سے ہمدردی جاگ اُٹھی ہو اَور اُس کی یہ ''حق ہُو، حق ہُو'' ہی اُس وقت اُن کی مشکل آسان کر سکتی ہو- وہ بایاں ہاتھ بڑھا کر گرتی ہوئی رضائی کو بچانے لگتے تو دائیں ہاتھ پر اُوپر تلے پڑے ہوئے دو کناروں کا

مُنہ کھلتا ہوا کوٹھے کی مٹی کو چاٹنے لگتا۔ اَب اُلگنی پر جھومتا جھولتا ''شب بخیر'' والا بچھونا ہی باقی رہ جاتا۔ چڑیا ایک بار پھر اُڑتی ہوئی آتی اَور کھونٹی کے مڑے ہوئے لوہے پر اَپنے پنجے جما لیتی۔ دُوسری کھونٹی سے ''جامہ جامہ، اَے صاحب جامہ'' کی آتی ہوئی آوازیں بھی رُکنے لگتیں کہ جیسے صاحبِ جامہ سے مزید چھیڑ چھاڑ کل تک کے لیے روک دی گئی ہو۔ بودی بابا رضائی پر گھٹنوں کے بَل جھکتے ہوئے دونوں ہاتھوں کے تھپیڑوں سے گرد جھاڑنے لگتے۔ اُن کے گلے کی دُھونکنی میں سے اپنے آپ خرخر کرتی پھونکیں بھاپ بن کر نکلنے لگتیں۔ بعض اَوقات تو یوں ہوتا کہ لعاب کا نم لحاف کے اَندر سے پر جا پڑتا' جیسے جھاگ کے بلبلے گاڑھے بھورے کاٹن پر اِدھر اُدھر اُبھر آئے ہوں اَور باقاعدہ سانس بھی لے رہے ہوں۔ تب اُن کی مَریل پھونکنی دم لیتی اَور وہ گلے میں پڑے مفلر کے ساتھ اُن سفید موتیوں کا گلا دبانے لگتے۔ جھاگ کے وہ بلبلے پھٹ کر پانی کی لکیر میں بدل جاتے تو وہ زیادہ پریشان ہو جاتے! سوچتے کہ رات کا گیلا ابھی خشک نہیں ہوا' اُس پر یہ نئی سیلن کہاں سے ٹپک پڑی! سردیاں آتیں تو جیسے اُن کی جان بھی سکڑ سمٹ کر آدھی رہ جاتی۔ ہر نماز میں اُن کی یہی دُعا ہوتی کہ اِس عمر میں بستر اگر گیلا ہو بھی جائے تو بس اِتنا کہ دُھوپ کے ہوتے ہوتے سوکھ جائے اَور اگر اوڑھنا بچھونا دونوں نہیں تو کم از کم بچھونا ہی رات میں کمر لگانے کے قابل ہو جائے۔ وہ خدا سے سورج کی بھیک مانگتے تو ایک ہی سانس میں مانگتے چلے جاتے کہ جیسے سانس ٹوٹا تو دُعا بھول جائے گی۔ مسجد میں اُن کی دُعا کبھی برابر میں بیٹھے ہوئے نمازی کے کان میں پڑتی تو وہ اُنھیں لقمہ دینے لگتا: ''بودی بابا، تم اِتنے لالچی ہو گئے ہو کہ سارے شہر کا سورج اپنی جھولی میں بھر کر بھی ''اَور مَولا اَور'' کرتے رہتے ہو! وہ شخص اُن کی چھت کی طرف اِشارہ کرتا اَور کہتا: ''تمھارے جیسے نہ جانے کتنے لوگ ہیں اِس شہر میں، جنھیں دُھوپ کی ضرورت تم سے زیادہ ہے..... کبھی بس مَولا بس کرنا بھی سیکھو!''

مگر اَب تو ''اَور مَولا اَور'' سے بھی اُن کا کام نہ بنتا تھا اَور تنبیہ کا وہ لقمہ اُن کے حلقوم میں ذرا سی کھانس کھنکار پیدا کرتا ہوا گُم ہو جاتا۔ بودی بابا دبے لفظوں میں کہتے: ''جا عبدالکریم' تیرا زہر بند ہو جائے' ساری دُعا کا سٹیاناس کر دیا''، سینے پر پھونک مارتے ہوئے اُٹھتے اَور اَلماری کھول کر جزدان والے اَور بغیر جزدان والے قرآن مجید دیکھنے لگتے۔

اِدھر بودی بابا چھت پر گری ہوئی رضائی کو جھاڑتے ہوئے رُکتے، کچھ دیر آسمان کی طرف دیکھتے اور سورج کو آنے جانے کا نیا راستہ بتانے لگتے: ''کیا تُو ہر شام مغرب میں ڈوب مرنے کے بجائے میرے بستر میں غرق نہیں ہو سکتا..... اور صبح صبح یہیں سے برآمد ہوا کرے تو کیا بگڑے گا تیرے مشرق کا؟'' اگلا خیال اُن کے ذہن میں یہ آتا کہ اگر مشرق مغرب دریافت ہی نہ ہوئے ہوتے تو کیا تھا: ''تو پھر تم نماز کے لیے کس طرف مُنہ کرتے اور کس طرف پیٹھ؟''

تب وہ آسمان پر جمی ہوئی نگاہ ہٹا کر گلے کی ہڈی پر لگے ہوئے اُونی مفلر کی گرہ کو ذرا ڈھیلا کرتے اور آنکھوں پر پڑے ٹوپی کے پھندنے کو ہٹانے کے لیے گردن کو یوں جھٹکتے کہ اُن کا سدھایا ہوا پھندنا جھٹ سے دائیں کان تک سرک جاتا..... دماغ کے اندر کا گناہ ایک جگہ سے اُڑ کر دوسری جگہ پہنچ جاتا اور وہ سمجھتے کہ دماغ سے نکل چکا ہے۔ پھر وہ ٹوپی کو سر سے ذرا اُونچا کر کے دوبارہ سر پر رکھتے تو اُن کے ماتھے کی محراب ایک لمحے کے لیے نمایاں ہوتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ فجر کے وقت کی نکالی ہوئی مانگ سر کے وسط سے اِدھر اُدھر ہو چکی ہوتی، جس سے وہ بے خبر ہوتے۔ اب بودی بابا رضائی اُٹھا کر دوبارہ انگنی پر پھیلانے لگتے۔ اُن کی پسلیوں میں سے نکلتی ہوئی، حصوں بخروں میں بٹی ایک لمبی آہ، کان کے پردوں پر کہرے کی طرح گرتی اور پھر جیسے برف کی گولیوں میں بدل جاتی۔ عبدالکریم، گرم حمام کی طرف بڑھتے ہوئے کہتا: ''میری باری ہے!'' بودی بابا بنچ پر بیٹھے رہ جاتے: ''تو اُوپر سے لکھوا کر لایا ہے باری..... کس نے لکھ کر دی ہے تجھے باری؟'' حمام کی چٹخنی بند ہو جاتی اور گرم پانی کے چھینٹے اُن کے پیروں پر پڑنے لگتے تو وہ ایک پاؤں کی ایڑی سے دوسرے پاؤں کی اُنگلیوں کو کھجانے لگتے۔ ساتھ ہی بودی بابا اخبار کی آڑ میں مُنہ چھپائے ''میری باری، میری باری'' کرتے رہتے جیسے اُس دن کی شہ سُرخی ہی ''میری باری'' ہو۔ کچھ دیر بعد وہ ایک نظر حمام پر ڈالتے، گردن کو ذرا اور ٹیڑھا کرتے ہوئے سر کو جھکاتے، جس سے بنچ کی لکڑی پر ٹکی ہوئی اُن کی پیٹھ بھی اپنی جگہ چھوڑ دیتی۔ وہ دروازے کی نچلی درز سے اندر جھانکتے تو عبدالکریم کے ٹخنوں پر نظر جا پڑتی۔ وہ اُلٹی ایڑی سے دروازے پر ہلکی سی چپت لگاتا اور پانی سے بھرے ہوئے منہ کے ساتھ اُونچی آواز میں بولتا: ''زیادہ جلدی ہے تو جا، کاٹوئیں گھاٹ پر چلا جا!''..... اپنی بات پر زور دیتے ہوئے عبدالکریم کو غوطہ لگ جاتا:

"جا.....گ.....ھا.....ٹ.....پر.....
چلا.....جا!" بودی بابا گھاٹ کا گلا کٹتے ہوئے دیکھتے تو اُن کے کانوں کی برف ایسی یخ لویں سرخ ہونے لگتیں؛ سینے پر ٹھونگا مارتے' جیسے کہ رہے ہوں: "وہ تو میرے اندر ہے!" تب وہ کھڑ کھڑ کرتے اخبار کو جھولی میں پھیلا کر اندرونی صفحوں کو یوں دیکھنے لگتے جیسے شہ سُرخی کا بقیہ حصہ ڈھونڈ رہے ہوں اور سوچ رہے ہوں: "کس قدر اندر ہے!"

ہمسایے کی چھت کا بسیرا بننے لگا تو کچھ ہی دِنوں میں الگنی پر بھی پردہ پڑ گیا۔ اب اُدھر کی پھونکیں پھنکاریں اُدھر ہی رہ جاتیں، صرف تھاپڑیوں کے شور سے پتا چلتا کہ دُوسری طرف کچھ ہو رہا ہے۔ کوئی بیرے کی اینٹوں سے کان لگا کر سنتا تو اندازہ ہوتا کہ ہے تو پھونکنی سے نکلتی ہوئی پھوں پھوں' مگر یوں کہ جیسے کوئی وظیفہ گو اپنی قضا ادا کر رہا ہو اور وقفے وقفے سے کہ رہا ہو: "جو پڑھا' وہ اُس کو پہنچا دینا؛ جو ابھی پڑھنا ہے' اُس کی مہلت دینا!"

ایک ایک دانے کا شمار ہوتا رہتا..... پھنکاروں کے اندر ہی اندر حلقوم سے نکلتی ہوئی یہ دُعائیہ خرخراہٹ ہر تیسرے چوتھے دن' بیرے کے دُوسری طرف سے سننے میں آتی رہتی۔ پھر لنگوٹا کیے ایک بودی بھاگتا ہوا آتا اور بودی بابا کو اپنی باتوں میں لگا لے جاتا۔ یوں اُن کے سر پر کی سیلن کو بہانا مل جاتا کہ گلیوں گلیوں سیاہی سفیدی جو چاہے کرتی پھرے۔

یہ ایک اور یہ دو چادریں "شب بخیر" والی.....ٹھیک؟ دو سرہانا پوش.....ٹھیک؟ پیٹیوں' صندوقوں کے اوچھاڑ' اگلے پھیرے پر.....ٹھیک؟"

چھیم دُلھن اپنی کھڑکی سے ایک ایک کر کے دھونے والے کپڑے باہر گلی میں سرکاتی تو اُس کے چاندی کے کنگن آپس میں ٹکرانے لگتے۔ کلائی کو ترچھا کر کے بازو کو سلاخوں سے باہر لے جانے اور پھر واپس اندر کھینچنے میں اُسے مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ پھر کہتی: "کُل ملا کے چار..... گن لو..... اس بار بھی میلے رہ گئے تو آدھے پیسے کاٹ لوں گی..... سُن لیا؟"

بودی اپنے پیروں پر گرے ہوئے وہ چاروں کپڑے اُٹھاتا' ایک ایک کنی پر پکی سیاہی سے وہ مار کے بناتا جو اُس نے چھیم دُلھن کے لیے مخصوص کر رکھے تھے اور زیرِ لب "چھی م دُلھن" کہتا ہوا نام کی ایک ایک زیر زبر کا لطف اُٹھاتا' حساب اپنی کاپی میں درج کر لیتا۔ چھیم دُلھن کو قلم کی حرکت سے اندازہ ہو جاتا کہ بودی مار کے

کی آڑ میں اُس کا نام لکھ رہا ہے؛ کہتی: ''نام ہی لکھنا ہے تو مالک کا نام لکھو' میرا کیوں لکھتے ہو!'' تو بودی اُنھیں کنیوں کو ایک بار پھر ہتھیلی کی اوٹ میں لے کر اُنھیں مارکوں کے برابر میں دو تین لکیریں کھینچ دیتا اور اُوپر نیچے ٹھکنے لگاتا ہوا کہتا: ''آ گیا مالک کا نام بھی!'' چھیم دُلھن ڈوپٹے کے ایک کنارے کو منہ میں دبا لیتی اور یوں سرگوشی کرنے لگتی جیسے کوئی راز اُگلنا چاہتی ہو: ''نیل کے چناخ نکال کر..... استری کچے کوئلوں کی نہ ہوا'' وہ چھیم دُلھن کا مال اپنی بڑی بچکی میں ٹھونستا جاتا اور چھیم دُلھن بولتی جاتی: ''سرھانوں پر نئی نئی رالیں نہ ٹپکالانا!''

بودی کھسیانا سا ہو جاتا جیسے کوئی چور سرِ عام اپنی چوری پکڑے جانے پر سزا کے ڈر سے اَدھ موا ہو گیا ہو۔ کہتا: ''سن لیا چھیم دُلھن' سن لیا..... بودی رال کے داغ نکالنے والا ہے' ٹپکانے والا نہیں' دُلھن!'' چھیم دُلھن سنتی تو کہتی: ''بودی' تم مجھے سیدھے سیدھے شیم اُلنسا کہا کرو! چھیم دُلھن کیوں کہتے ہو؟ اور آج تو تم نے حد ہی کر دی ہے: چھیم دُلھن بھی نہیں' بے شرموں کی طرح دُلھن ہی کہہ ڈالا ہے۔ تم باز نہ آئے تو میں بھی تمھیں بودی نہیں' بودی بابا کہوں گی اور تمھاری بستی میں مشہور کروا دوں گی..... بودی بابا، بودی بابا۔ پھر کوئی لڑکی تم سے شادی کے لیے تیار نہ ہوگی۔ بولو، کنوارے مرنا پسند کرو گے یا اپنی زبان کو لگام دو گے؟'' اُس وقت چھیم دُلھن کے ہونٹوں کے شکنجے میں آیا ہوا ڈوپٹے کا کنارہ آزاد ہو جاتا۔ اُس کی گردن پر سُرخ ڈوری سے بنی ہوئی لکیر دِکھائی دینے لگتی جیسے ابھی ابھی گلوبند اُتار کر آئی ہو۔

بودی اپنی کاپی دائیں جیب میں ڈالتا اور قلم کو کان کے ساتھ ٹکاتے ہوئے یوں ظاہر کرتا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ کہتا: ''اِس بار سات پانیوں میں دھوؤں گا تو پچھلی کسریں بھی نکال دوں گا! تُو فکر نہ کر..... اَب عید پر ہی بچھانا 'شب بخیر' والی چادریں..... مالک کو خوش کر دینا!''

چھیم دُلھن کھڑکی بند کر کے، سوچنے لگتی: 'عید پر کیوں' چھلے پر کیوں نہیں..... مالک زیادہ خوش ہوگا!'' پھر وہ شرماتی ہوئی کمرے میں چلی جاتی اور پلنگوں پر پڑے ہوئے گدّے جھاڑنے لگتی۔ بودی مارکوں اور ٹھکوں کو مصری کی ڈلیوں کی طرح زبان پر رکھے کھڑکی کے سامنے کھڑا سوچتا رہتا: 'چھیم، جیسے پانی کی چھپا چھپ' دُلھن' جیسے میرے پنکھوں کی دھپ دھپ..... ام ام ام چھیم دُلھن پوری کی پوری چھپ چھپ' دھپ دھپ..... یہ عورت نہ ہوتی تو گھاٹ

ہوتی..... کاٹواں گھاٹ' میلے کچیلوں کو ڈبوتا، نچوڑتا، نتھارتا ہوا' مالک کا گھاٹ..... صاف ہی صاف' پاک ہی پاک!"

اَب اُدھر گلی میں بلگرامی بوا کے بَین بلند ہونے لگتے: "ارے میں نے گھاٹ کیوں نہ بدل لیا؛ یہ موا جس پانی میں نو بیاہتوں کے بچھونے دھوتا ہے' اُسی میں میلاد کی چاندنیاں بھی ڈال دیتا ہے؛ نتھارے نچوڑے بغیر ہی ایک کا کپڑا الٹا دوسرے پر پھینکتا جاتا ہے..... پتا ہی نہیں چلتا، ہمارے شاروں کے تھیلے دُھل رہے ہیں یا سہاگنوں کے سرہانے، تیرتے پھرتے، اَشنان کر رہے ہیں!" تب بودی زبان پر گھلتی ہوئی شیرینی کو پس اَنداز کرنے کے چکروں میں ہوتا۔ وہ زبان کو چکمہ دے کر سر پر کھڑی رات کے لیے کچھ نہ کچھ بیٹھا بچا ہی لیتا۔ اُس وقت غیب سے اگر کوئی ٹھٹھا کرتا: "کنجوس!"، تو اُسے بہت خوشی ہوتی کہ "ہاں میں ہوں کنجوس، تمھیں اِس سے کیا!" پھر وہ بوا کے قریب آ کر اپنی گٹھڑی پھینکتا اَور کہتا: "جا بدل لے گھاٹ بھی اَور کھاٹ بھی؛ میں تو نہیں بدلوں گا اپنے جدّی پشتی طریقے کو: چلتے پانی میں دھوتا ہوں' کھڑے میں نہیں..... سنا نہیں' چلتے پانی میں پلیدی رُکتی نہیں' آگے نکل جاتی ہے اَور سترھویں قدم پر پاکی میں بدل جاتی ہے!" وہ گٹھڑی کے اَندر ہاتھ ڈال کر "شب بخیر" والی چادروں کو تھپتھپاتے ہوئے کہتا: "تیرے پاس ثبوت ہے تو کیس کر دے بودی پر..... تُو جیت گئی تو بودی پورے کا پورا کاٹواں گھاٹ کھینچ کر تیرے قدموں میں ڈال دے گا اَور خود کہیں مُنہ کر جائے گا۔" تب بُوا کہتی: "اَور اگر تو جیت گیا تو؟"

تو تیری باری چھلیم دُلھن کے بعد ہی آئے گی' پہلے نہیں!

ہُونہہ..... بڑا آیا باریاں بانٹنے والا!

وہ اپنی گٹھڑی کو کھولتے ہوئے کہتا: "بودی کو سارے مسئلے آتے ہیں بُوا' ایسے ہی کوہِ ہمالیہ نہیں کاندھے پر اُٹھائے پھرتا!" پھر وہ گٹھڑی کو بانہوں کے گھیرے میں لے کر کہتا: "یہ ہمالیہ..... بُوا، تُو نہیں مانتی تو اَپنا گھاٹ بدل لے!"

سب سے اُوپر "شب بخیر" والی چرمر چادریں دِکھائی دے جاتیں۔

بُوا سینے پر ہلکا سا دو ہتھڑ مارتے ہوئے کہتی: ہائے ہائے، گھاٹ بدلنے کہاں نکل جاؤں اِس عُمر میں..... واپس گنگا جل میں ڈوب مَروں؟..... تُم تو کہتے ہو بوا دفع دفان ہو اَور میری لائن سیدھی ہو!

ہاں تو چلی جا، گنگا کون سا دُور ہے راج گڑھ سے..... راوی کے اُس پار ہی تو ہے' کسی

کشتی میں بیٹھ جا' لے جائے گی تجھے نانی کے گھر!

میں چلی جاؤں اُس پار اور تم اِس پار بیٹھے جیسے چاہو..... سیاہی کرو' سفیدی کرو!

بُوا کی آواز رُندھ جاتی اور بودی موقع غنیمت جانتے ہوئے ''سیاہی سفیدی'' کا مطلب سمجھے چھیم دُلھن کے تعاقب میں ''شب بخیر'' والی چادروں پر اُودھم مچانے نکل جاتا۔ ''موتی ٹانکا'' کی کڑھائی والا سُرخ چوکھٹا' ایک 'شب بخیر' دُوسرے 'شب بخیر' سے جُڑی ہوئی، تکیوں پر آمنے سامنے تکونی بیلیں..... اور وہ دونوں' چادروں پر ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے..... آگے آگے چھیم دُلھن' پیچھے پیچھے بودی؛ اُس کے بالوں کی سیاہ لٹ بھی ساتھ ساتھ اُچھلتی جاتی۔ بودی چھیم دُلھن کو تھاپ لگاتا تو وُہ دُہری ہو کر تکیے پر گرتی اور ہانپتے ہوئے کہتی: ''تکیہ بیچ میں نہ آتا تو میں بھلا پکڑی جاتی؛ شکر ہے پاؤں نہیں آیا تکیے پر.....

اَب تو جا' وہ آتے ہوں گے!'' بودی تھاپ لگا کر واپس آتا تو اُس کے سفید رنگ میں پیشانی سے پیروں تک لالی گھل چکی ہوتی اور بھنوؤں پر رُکے ہوئے پسینے کے قطرے ٹپ ٹپ کرتی انگنی کے مانند آنکھوں پر گرنے لگتے۔ بُوا اپنی چاندیاں اُس کی گٹھڑی پر رکھتے ہوئے کہتی: ''لے پکڑ' ہمالیہ کو اور اُونچا کر لے!'' بودی گٹھڑی پر دونوں ہاتھوں سے پُورا وزن ڈالتے ہوئے کہتا: ''کر لیا اُونچا..... آسمان تک اُونچا!'' بُوا تاکید کرتی: ''احتیاط سے لے جانا' گلیوں گلیوں جھاڑو نہ پھیرتے جانا!'' بودی کان سے قلم اُتار کر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا: ''دیکھ بُوا، میں تو مذاق کر رہا تھا' اپنی گائی پر کون لات مارتا ہے..... جا' سارے کا سارا رادی تیرے نام کیا'..... بس تو میرے کاٹویں گھاٹ پر نظر نہ رکھا کر' اِکلوتا ہے بے چارہ..... یہ ہے تو تیرے ہاتھ پاؤں چلتے پھرتے ہیں' ورنہ سرکاری ٹونٹیوں سے کپڑوں کی پنڈ دھونا پڑ گئی تو مونڈھے رہ جائیں گے تیرے!''

توبہ اللہ معاف کرے۔ راج گڑھ کا بے اعتبار پانی تو سبزی ترکاری کو پورا نہیں پڑتا۔ غسل اور وضو کرتے دغا دے جاتا ہے۔ میلی بُچھیوں کے مُنہ کیسے کھول دیں اِس خالی خُولی خرخر کے نیچے!

بُوا سرکاری پانی کا رونا رونے لگتی۔ اپنی ساڑھی کے پلو کو سر پر اوڑھتے ہوئے بودی کی طرف دیکھتی جو اُس وقت دِل ہی دِل میں کچھ مانگ رہا ہوتا: ''یا اللہ' راج گڑھ کی ٹونٹیوں اور نلکوں میں اِتنا پانی نہ اُتار دینا کہ میرا گھاٹ ہی بند ہو جائے!'' پھر وہ گلی میں کھڑے کھڑے اپنے مشہور دھوبی پٹکوں

کا مظاہرہ کرنے لگتا اور کہتا: ''بُودا' ایسی طاقت ہے کسی کے پٹھوں میں؟'' ہوائی پکلوں کی آوازیں سن کر چھیم دُلھن ایک بار پھر کھڑکی میں آتی اور پوچھتی: ''ہائے اللہ' یہ تیر کہاں چل رہے ہیں؟'' بودی اُس کی طرف دیکھ کر سینے پر ہاتھ جماتے ہوئے کہتا: ''یہاں چھیم دُلھن' یہاں!'' وہ آہستہ سے جواب دیتی: ''کہاں بودی بابا، کہاں؟'' اور کھڑکی بند کر لیتی۔ بُوا بند ہوتی کھڑکی کی طرف دیکھتی اور پھر بودی کی گٹھڑی پر نظر ڈالتی۔ کہتی: ''دھوون ادھر کا اُدھر کیے بنا چارہ نہیں تو دِل میں کلمہ ہی پڑھ لیا کر!'' پھر وہ ایک بڑا تھیلا اُسے پکڑاتے ہوئے کہتی: ''یہ جلدی واپس کر دینا۔ شمارے چارپائی پر کھلے پڑے ہیں' اِدھر اُدھر نہ ہو جائیں' پہلے ہی مشکل سے گنتی پُوری کی ہے..... اَب تیری بُوا محلّے کے سوم ساتے بھگتانے کے لیے ہی تو زندہ ہے' جلدی کرنا!'' بودی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگتا۔ بُوا اپنے آپ میں مگن ہونٹ ہلاتی جاتی: ''مالک نے مجھے چننا تھا اِس کام کے لیے چن لیا۔ جبھی تو وہ مجھے ہندوستان سے پاکستان لے آیا۔ اَور تو چاہتا ہے، بُوا پھر سے گنگا کی راہ لے..... تُو کرے گا یہ کام' جو میں کرتی ہوں؟''

بودی کو اُس لمحے بُوا کی آنکھوں میں گنگا جل کہیں نظر نہ آتا..... تا حدِ نظر صرف راوی بہتا ہوا دِکھائی دیتا۔ بُوا کہتی: ''بس خیال کیا کر' داغ داغ میں بھی فرق ہوتا ہے' تیرا گھاٹ کوئی جل تھوڑی ہے جسے پتا ہو کون سا داغ کیا ہے' کس کا ہے' کہاں کا ہے؟'' پھر وہ ذرا رُک کر بولتی: ''گھاٹ کو تو بتانا پڑتا ہے داغ کا' اِس کی آنکھیں ہوتیں تو ایسے ہی پڑا رہتا تیری مار پیٹ سہنے کے لیے؟''

بودی سنتا جاتا اور گٹھڑی پر گھٹنوں کے بل بیٹھا بیٹھا پکی سیاہی سے بوا کی چاندنیوں اور تھیلوں پر نشان لگاتا جاتا۔ کہتا: ''بُوا، تیرے مال پر تو یہی مارکا بنتا ہے!'' بُوا، بودی کی بُقچی میں سے کپڑے نکال نکال کے کنی' کنارے اور کالر دیکھنے لگتی۔ اُسے لگتا' سارے مارکے ایک جیسے ہیں۔ پھر وہ اپنے پلو کے ایک کنارے کو دائیں پسلی کی طرف بلاؤز کے اندر ڈالتے ہوئے جھک کر بودی کو دیکھنے لگتی اور کہتی: ''بھلے ہی مرضی کا مارکا لگا' مگر کسی دُوسرے مارکے سے نہ ملا دینا کہ کل کلاں کو اِدھر اُدھر سے کوئی چاندنی اُٹھا کر لے آؤ اور کہو کہ بُوا دیکھ تو بودی کے نیل اور لیکو کا کمال!'' بودی لکھتا جاتا اور بُوا اپنی کمر پر ہاتھ رکھے اُس سے پوچھتی جاتی: ''دھوبیوں کی بستی میں کلمہ تو اُترا ہو گا' پڑھ لیا کر' اچھا ہوتا ہے!''

بودی، گٹھڑی پُشت پر لاد کر چل پڑتا تو بوا کی آواز اُس کا تعاقب کرتی رہتی: ''سنتے ہو لوگو..... گھاٹ کے سات پانی..... گھاٹ نہ ہوا، آسمان ہوا..... ایک سے سات تک!'' وہ یہ بات سناتی تو بودی کو مگر اُس کا مُنہ چھیم دُلھن کے دروازے کی طرف ہوتا جو اُس وقت سِنگار میز کے سامنے کھڑی، گردن کے گرد کھنچی ہوئی لہو کی لکیر پر اپنی اُنگلیاں پھیر رہی ہوتی: ''ارے یہ تو میلاد پر سیپارہ بھی پورا نہیں پڑھتی، بس آدھا پڑھ کر مجھے پکڑا دیتی ہے..... لے بُوا، تیرا بڑا محاورہ ہے..... یہ بھی پڑھ دے، میرا لفافہ بھی آدھا لے لینا اور ثواب بھی..... پڑھ دے نا پیاری بوا، میرے پاؤں سُوج رہے ہیں، ٹھنڈے فرش پر بیٹھا نہیں جا رہا!'' پھر چھیم دُلھن برآمدے میں پڑے مُوڑھے پر بیٹھ جاتی اور اپنے کنگن دائیں ہاتھ سے اُتار کر بائیں میں چڑھانے لگتی؛ اُسے بائیں کلائی دائیں کی بہ نسبت کچھ ہلکی محسوس ہوتی تو کنگن چھنکا کر کہتی: ''اب اسی ہاتھ پر ٹھیک ہیں!'' وہ اپنی دائیں کلائی کو خالی دیکھ کر اُٹھتی اور انگیٹھی پر پڑی ہوئی گھڑی اُٹھا کر پہننے لگتی۔ بازو کو اپنی گود میں رکھے سنہری سٹریپ کے کبھی ایک سُوراخ میں پن ڈالتی اور کبھی دُوسرے میں۔ پھر دونوں کہنیاں اپنی جھولی میں ٹکا کر دائیں بائیں دیکھتی اور کہتی: ''اب ٹھیک ہے!''

جیسے جیسے چھیم دُلھن کا جسم بھرتا جا رہا تھا، اُسے اپنی کھڑکی سے سَودا سلف پکڑتے پکڑاتے میں مشکل پیش آنے لگی تھی۔ اُس کے کنگن بازو کے گوشت میں جیسے پیوست ہوتے جا رہے تھے اور چاندی سے چاندی ٹکرانے کی کھنک بھی کم ہو چلی تھی۔ بودی اُسے کھڑکی کی سلاخوں سے بھڑتے ہوئے دیکھتا تو کہتا: ''تُو ڈیوڑھی میں رکھ دیا کر، میں خود ہی اُٹھا لیا کروں گا!'' بودی یہ بات یُوں کرتا جیسے چھیم دُلھن کے پل ڈول میں آئے دِن کی تبدیلیوں کا ذمے دار وہ خود ہو۔

وہ فیصلے کا دِن تھا جب چھیم دُلھن کی گردن پر کھنچا سُرخ دائرہ بودی کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ بودی کاٹویں گھاٹ پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ بُوا کی چاندنیاں پہلے پانی میں ڈالے یا چھیم دُلھن کی ''شب بخیر'' والی چادریں..... اِسی گومگو میں گٹھڑی کے اندر ہاتھ ڈالا تو پہلا نمبر بوا کا نکلا۔ اُس نے ایک چاندنی نکالی اور اُسے سورج کے سامنے تان کر دیکھنے لگا۔ سیدھے رُخ سے دیکھا تو اُس پار تک دِکھائی دیا؛ اُلٹے رُخ پر جا کر دیکھا تو اِس پار گھاٹ کے سِرے پر بنی سیمنٹ کی اُونچی تھڑی کو دیکھ لیا۔ پھر وہ چاندنی کے ایک کنارے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا: ''میلاد پر چھیم دُلھن یہیں

بیٹھ کر آدھا سیپارہ پڑھتی ہوگی۔'' وہ اُس چاندنی کو بالشتوں سے ماپتے ہوئے ہاتھ دُوسرے کنارے تک لے گیا، پھر ایک دُوسری چاندنی کو پہلی کے ساتھ جوڑا اور اُس پر بالشتوں کا فیتا پھیرتے ہوئے ایک جگہ پر ہاتھ روک دیا۔ کہنے لگا: ''لگتا ہے دہلیز آگئی ہے۔ یہ چھیم دُلھن کے آنے جانے کا راستہ ہوگا۔ میلا دمیں آتی ہوگی تو اِتنے ہی قدم اُٹھاتی ہوگی جتنے میں نے ماپ لیے۔ اور جب بوندی بدانے سے بھرا لفافہ ہاتھ میں لٹکائے گھر جاتی ہوگی تو اِسی فیتے پر پاؤں رکھتی ہوئی باہر نکل جاتی ہوگی۔'' ذرا رُک کر بولا: ''پھر تو بُوا کی چاندنیاں صاف ہی ہوئیں، مگر میں تو اپنا بھاڑا کھرا کر کے رہوں گا، ایک ٹیڈی بھی نہ چھوڑوں گا۔'' اُس نے چاندنیوں کی تہہ بنا کر ایک طرف رکھ لی اور سوچا: ''اِستری کر کے واپس کر دُوں گا، جھوٹ موٹ کہہ دُوں گا کہ سات پانیوں میں دھو کر لایا ہوں۔ اُسے کیا پتا چلے گا، اُس نے گنگا دیکھا ہے یا راوی یا سرکاری پانی، سات دیکھے ہوں گے تو جرح کرے گی نا!''

اَب اُس نے چھیم دُلھن کی دو چادریں اور دو تکیہ پوش اپنے سامنے پھیلا لیے اور کچے پکے داغوں کو گننے لگا۔ ایک آواز چھیم دُلھن کی آئی: ''میرے مالک کا نام پتا لکھا کرو!'' پھر وہ آواز کنگنوں کی طرح کھنکتے ہوئے سارے گھاٹ میں گھل گئی۔ بودی کاپی کھول کر، صفحے اُلٹتا ہوا چھیم دُلھن کے کھاتے پر پہنچ کر رُکا اور اپنا ہی لکھا ہوا آہستہ آہستہ منہ میں پڑھنے لگا: ''پہلی دُھلائی چار کپڑے۔ 'شب بخیر' والی دو چادریں اور دو تکیہ پوش۔ وصولی مورخہ یکم دسمبر ۱۹۷۰ء واپسی طے پائی ۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء۔'' ایک سطر خالی چھوڑ کر لکھا تھا: ''مالکن کی تاکید..... نئی چادریں ہیں، احتیاط سے دھونی ہیں، کڑھائی پر ڈنڈے نہیں لگانے، نچوڑتے ہوئے زیادہ بل نہیں دینے اور دُھوپ میں اُلٹا کر ڈالنی ہیں۔'' ایک اور ورق پر لکھا تھا: ''وصولی ایک روپیہ، بقایا ستر روپے۔'' بودی پڑھتا چلا گیا اور پھر پوری کاپی کی ورق گردانی کرنے کے بعد اُس نے کاپی جیب میں ڈال لی اور منہ میں کچھ کہا، جس کا مطلب تھا: ''پچھلی چھٹی تھی یا یہ چھٹی ہے!'' وہ چھیم دُلھن کے چاروں کپڑوں کو پانی کی سطح پر پھیلا کر خود بھی پانی کو دیکھنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ پکڑن پکڑائی میں پڑنے والے نشان چلنے پھرنے کے قابل ہو چکے تھے..... ایک ایک نشان چادروں سے الگ ہوتا ہوا اپنی اپنی رَو میں بہہ نکلا تھا۔ ستر قدم پر کسی نے پانی کو اُوک میں لے کر کُلّی کی، اگلے ستر قدم پر ایک مسافر نے مشکیزہ بھرا اور سب قافلے والے پیاس بجھانے اُس کی طرف لپکے۔

بودی بابا تیس سال بعد بھی جب شب بخیر والے بستر پر لیٹتے تو پکڑن پکڑائی کھیلتے ہوئے کہیں کے کہیں جا نکلتے۔ سامنے تھاپ لگا کر کروٹ بدل لیتے جیسے کھیل سے واپس آ گئے ہوں۔ وہاں سے اپنا ہمالیہ کاندھے پر اُٹھائے گھاٹ پر جا پہنچتے۔ وہ اِسی مخمصے میں رہتے کہ بُوا کو پہلے نپٹائیں یا چھیم دُلھن کو یا اِن دونوں سے پہلے کسی اور کو ارضائی اُن کے مُنہ پر ہوتی اور گلے میں سے بہتے ہوئے پانی کی اُداس کر دینے والی آوازیں نکلتی رہتیں۔

سات دن بعد بودی اپنی گٹھڑی اُٹھائے چھیم دُلھن کی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے ایک درز سے اندر جھانکا تو بُوا کی خمیدہ کمر پر نظر پڑی۔ پھر جیسے درز' دروازہ بن گئی اور رنگ رنگ کے کنیاں کنارے اُس کی آنکھوں میں بھرنے لگے۔ بُوا صحن میں دوزانو بیٹھی خواتین کے سامنے شاروں کی ڈھیریاں لگانے میں مصروف تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے کمر کو سیدھا کرتی اور کُولھوں کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے جُھک کر شارے تقسیم کرنے لگتی۔ وہ صحن میں بچھی ہوئی دریوں پر اکیلی چل پھر رہی تھی جیسے اپنے شاروں کی نگرانی کر رہی ہو۔ بُوا شارے تقسیم کر چکی تو بولی: ''ساری بیبیاں اپنی گنتی خود یاد رکھیں..... جو پہلے ختم کر لے وہ پھر شروع ہو جائے اور مجھے بتا دے، دُعا اُسی حساب سے ہوگی کہ سوا لاکھ کے اُوپر جتنا پڑھا گیا' وہ سب بھی اُسی کو پہنچے کسی اور کو نہیں۔'' پھر اُس نے اگربتی جلا کر ایک دروازے کی درز میں ٹکا دی اور ساڑھی کے پلّو سے چشمہ صاف کرتے ہوئے اُن بیبیوں کے درمیان جا بیٹھی۔ شمارے پر شمار دگرنے کی بے ترتیب آوازیں اور بلند ہونے لگیں۔ بودی کے ٹین جیسے دماغ پر رُک رُک کر گرتے ہوئے بارش کے قطرے اب ایک مستقل ساز کی طرح بجنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد ایک ایک خاتون اُٹھ کر بُوا کے پاس جاتی اور اپنا اپنا شمار بتانے لگتی۔ بُوا اپنی اُنگلیوں پر حساب کرتی جاتی اور خوش ہوتی جاتی۔

بودی نے یہ سب دیکھا تو اُس کا ہاتھ اپنی سربند پگڑی پر جا پڑا۔ سب سے اُوپر بُوا کی چاندنیوں کی تہہ لگی ہوئی تھی۔ اُس نے تازہ اِستری کی ہوئی چاندنیوں کو مُٹھی میں بھینچ لیا اور اپنے سات دِن پرانے جھوٹ کو یاد کرتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ کاٹواں گھاٹ اُس کے قدموں میں بچھا تھا اور سترھویں قدم تک تعاقب پر مامور لمبی قطاروں میں لوگ اکیلے آدمی کے پیچھے چل رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

گلیڈی ایٹر

ایک کھٹکا سا ہوا، جیسے کوئی داخلی دروازے سے آ کر ٹکرایا ہو

''کون ہے دروازے پر؟''

راہبِ اعظم نے چونک کر پوچھا

کلیسا کی دیواروں سے باد و باراں کا طوفان ٹکرا رہا تھا، ہوائیں کسی وحشی سانڈ کی مانند سنگی دیواروں پر سر مارتیں اور بے دم ہو کر گر جاتیں، وقفے وقفے سے آسمان پر ایک روشن ٹیڑھی میڑھی لکیر نمودار ہوتی، جیسے آسمان میں دراڑ پڑ گئی ہو اور پھر ایک زوردار کڑاکا ماحول کی ہیبت میں اضافہ کر دیتا، مجموعی طور پر یہ ایک خوفناک رات تھی۔

''جانے کون بے چارہ ہے رات کے پچھلے پہر، یسوع مسیح اس پر اپنا کرم فرمائے''

ضعیف راہبِ اعظم نے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے خود کلامی کی اور دروازے کی طرف بڑھے

دروازہ کھولنے پر کوئی دھم سے اندر آ گرا

راہبِ اعظم بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹے

یہ ایک بچہ تھا، عمر سات آٹھ سال کے لگ بھگ تھی اور چہرے پر نقاہت اور بے چینی مترشح تھی، اس وقت یقینی طور پر وہ بے ہوش تھا

''اوہ، لگتا ہے بے چارہ ہوش و حواس میں نہیں، مائی لٹل چائلڈ----''

پریشانی راہبِ اعظم کے چہرے سے چھلک رہی تھی

''ڈیوڈ، کہاں ہو تم، جلدی سے ادھر آؤ''

بوڑھے راہب نے چرچ کے خدمتگار کو آواز دی، فوراً ادھیڑ عمر ڈیوڈ اندرونی ہال سے برآمد ہوا، بچے کو زمین پر بے سدھ دیکھ کر اس کے قدموں میں تیزی در آئی

''فادر، کون ہے یہ ننھی روح؟---''

ڈیوڈ نے بے اختیار بچے کو بازوؤں میں اٹھا لیا

''کسے معلوم ڈیوڈ، شاید آسمانوں سے ٹوٹا کوئی تارہ، یا پھر شاید دریائے اردن کی مقدس فضاؤں میں اڑتا کوئی معصوم ابابیل----''

راہبِ اعظم نے کھوئے لہجے میں کہا

بچہ بے ہوشی میں بھی سسکیاں لے رہا تھا

''سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں، سب نفرت کرتے ہیں-- نہیں جینا چاہتا میں فادر''

یہ نیا روم تھا، آج کا روم-----بلند و بالا

احمد سجاد بابر

عمارات کے ساتھ پراسراریت کی دھند میں لپٹا شہر---- کرسمس کی وجہ سے شہر دلہن کی طرح جگمگا رہا تھا، سانتا کلاز اپنے مخصوص کاسٹیوم پہنے بچوں میں تحائف تقسیم کر رہے تھے، کرسمس ٹری ماحول کو خوبصورت بنا رہے تھے، شہر کے قدیم کلیسا میں بھی ایک خاص تقریب شروع ہونے جا رہی تھی، یہ وہ تقریب تھی جو صدیوں سے جاری تھی، اس متبرک دن راہب اعظم شہر کے باسیوں میں محبت، امن، سکون کا باعث بننے والوں میں میڈل اور اعزاز تقسیم کرتے تھے، یہ اعزاز کسی بھی فرد کو اس کے ذاتی کارنامے پر بھی دیا جاتا تھا یا پھر اس کے بزرگوں میں اگر کسی نے کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہو جسے محبت کا سرچشمہ قرار دیا جا سکے، تو اس کی بعد کی نسلوں کو بھی اس ایوارڈ کا حق دار قرار دیا جا سکتا تھا، یہ ایوارڈ عزت اور وقار کا سمبل بن چکا تھا، اسے ''میڈل آف لوو'' کا نام دیا گیا تھا، ہر کسی کی خواہش ہوتی تھی کہ اس سال یہ اعزاز اس کے خاندان کا حصہ بنے، جس فیملی میں یہ میڈل آتا، اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا، تمام سرکاری اور نجی تقریبات میں اس خاندان کو خاص مہمان کے طور پر مدعو کیا جاتا تھا، شاہی تقریبات میں بھی اس خاندان کو اہمیت دی جاتی، یہ سنہری رنگ کا طلائی میڈل ہوتا تھا جو نیلے رنگ کے ربن میں بندھا ہوتا تھا، میڈل کی گولائی کے وسط میں ایک نقرئی رنگ کی صلیب اور درمیان میں ایک اڑنے کو تیار عقاب کی تصویر کندہ تھی۔

آج بھی وہی خاص دن تھا--- کلوسیئم (Colosseum) کی قدیم عمارت شہر کے باسیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، یہ وہی عمارت تھی جس میں ہزاروں سال پہلے موت اور خون کا کھیل کھیلا جاتا تھا--- فضا لوبان اور صندل کی خوشبو سے لبریز تھی، کلوسیئم کے اندر کا ماحول ویسا ہی بنایا گیا تھا جیسے قبل مسیح کے سیاہ دور میں ہوا کرتا تھا، شاہی خاندان سٹیج پر زرق برق لباس میں موجود تھا، کنگ بنفسِ نفیس موجود تھے، مگر اس تقریب کی سب سے اہم شخصیت راہب اعظم تھے، جن کا خاندان صدیوں سے اس قدیم اور بڑے کلیسا کا بشپ چلا آ رہا تھا، راہب اعظم اس وقت اپنے مخصوص طلائی لبادے میں ملبوس تھے، سر پر سنہری بڑ نما لمبوتری پگڑی، گلے میں صلیب، انگلی میں بشپ کی علامتی انگوٹھی اور ہاتھ میں دھاتی خمدار کروزیئر (خمدار دھاتی لاٹھی) تھی جو ان کو رعب دار بنا رہی تھی، ہال میں ہزاروں لوگ دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے، سٹیج کے دائیں جانب میڈل کے انتخاب کی جیوری کے افراد اپنی منقش چوبی کرسیوں پر باوقار انداز میں براجمان تھے، جیوری کا انتخاب بھی شہر کے ذہین اور دانشور طبقے سے کیا جاتا تھا، جیوری کی رائے کے بعد حتمی فیصلہ راہب اعظم کو ہی کرنا ہوتا تھا۔

مذہبی رسومات کی ادائیگی کے بعد پنڈال میں سناٹا چھا گیا، سب کی نگاہیں جھکی ہوئی

تھیں، راہب اعظم میڈل کے اعلان کے لئے اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے

''اس سال کے میڈل آف لوو کے لئے بھی کئی لوگوں میں سخت مقابلہ تھا، بہت مشکل ہو چلا تھا فیصلہ کرنا، مگر فیصلہ تو کرنا ہی تھا ---اور پھر فیصلہ ہو گیا---''

راہب اعظم نے تجسس بھرے انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا، پنڈال میں بے چینی کی ایک لہر پیدا ہوئی، سامعین نے بے چینی سے پہلو بدلے

''میں اب ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کرنا چاہتا---''

راہب اعظم نے پراسرار انداز میں کہا، ان کے چہرے پر ایک بھید بھری مسکراہٹ تھی بہت سے لوگ آج کے میڈل کے لئے امید لے کر آئے تھے، ان کے چہرے سُتے ہوئے اور آنکھوں میں امید ہلکورے لے رہی تھی، اس وقت سب سے زیادہ بے تابی انہی کے انداز سے ہویدا تھی۔

''میں ایک ایسے فرد کو بلانے لگا ہوں کہ بظاہر تو اس کی زندگی اور اس کے اجداد کی زندگی محبت سے خالی نظر آتی ہے مگر میرے وجدان نے میری رہنمائی کی ہے کہ اس سال کے میڈل آف لوو کا اس سے بڑا حقدار کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا---ہاں یہ میرے اندر کی آواز تھی جس نے مجھے بتایا، میری نگاہوں نے اس کے ماتھے پر جگمگاتی روشنی دیکھ لی تھی''

راہب اعظم نے ذرا سا توقف کیا، بے چینی کی ایک لہر کلوسیم کے ایک کونے سے دوسرے تک پھیلتی چلی گئی

''ہمارے آج کے معزز مہمان کو سامنے لایا جائے''

راہب اعظم نے صلیب پر انگلی پھیرتے ہوئے بارعب آواز میں کہا

ہال میں ایک گہرا سکوت چھایا تھا، صرف بے چین سانسوں کی آواز تھی جو فضا میں گونج رہی تھی، ہزاروں نگاہیں سٹیج کے عقب میں جمی تھیں جہاں سے آج کے مہمان کو آنا تھا

کلیسا کے خدمت گاروں کے دائرے میں زرق برق لباس میں ملبوس ایک بچے کو سٹیج پر لایا گیا

ہال میں گہرا سناٹا تھا، مہیب سناٹا---!!

اچانک ہال میں سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ پیدا ہوئی جو تھوڑی دیر میں شور میں ڈھل گئی

''ہم نہیں مانتے اس فیصلے کو، یہ اس میڈل کی توہین ہے، یہ ہماری روایات کی توہین ہے---''

کئی آوازیں ایک ساتھ ہال میں گونجیں، جیسے کسی نے ہال میں بم چلا دیا ہو، کبھی ایسے نہ ہوا تھا کہ کسی نے راہب اعظم کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہو، مگر آج انہونی ہو چکی تھی، شاہی خاندان بھی تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا، سارا ہی ہال احتجاج میں کھڑا ہو چکا تھا، کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی

''یہ ظالم لوگوں کی نسل ہے، سنگدل اور پتھر دل لوگوں کا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے---''

کچھ آوازیں کلوسیم کی سنگی دیواروں

سے ٹکرائیں۔

''یہ غدار اسپارٹکس کی نسل سے ہے، جس نے بغاوت کی تھی، جس کی وجہ سے روما کی سلطنت تباہ ہوتے ہوتے بچی تھی''

چند مزید آوازوں کی بازگشت چمگادڑوں کی طرح چھت سے لٹک گئیں

''لوومیڈل کی اتنی توہین--- گلیڈی ایٹرز کے خاندان میں جائے گا محبت کا پیغام--- ارے ان کو کیا پتہ کہ محبت کیا ہے--- قاتل ہیں یہ قاتل---''

آوازوں کے بگولے ہال میں چکرا رہے تھے، بچے کا چہرہ ذلت کے احساس سے سفید پڑ گیا تھا، ایک خدمت گار نے اسے محبت کے ساتھ خود سے لپٹا لیا تھا ورنہ وہ کب کا گر چکا ہوتا

''خاموش--- میں کہتا ہوں چپ ہو جاؤ''

راہب اعظم کی پتھریلی آواز نے جیسے ان پر طلسم پھونک دیا، ہال میں پھر سے گہرا سکوت تھا مگر احتجاج کی لہر ابھی تک گردش میں تھی

''میں جانتا ہوں کہ تم لوگ کیا سوچ رہے ہو--- اور ٹھیک ہی سوچ ہے تمہاری، کیونکہ تم نے ویسا سوچا جیسا تم نے سوچنا چاہا، چاہے حقیقت جو بھی تھی مگر تم حقائق سے آج تک نظریں چرا رہے ہو--- اس کا خاندان قاتل کیسے ہوا جبکہ ان کو خونی درندے کے قتل یا اپنی بقا میں سے کسی ایک کو چنا تھا--!!---''

''یہ سچ ہے کہ اس بچے کی رگوں میں اسپارٹکس کا خون دوڑ رہا ہے، وہی اسپارٹکس جو باغی تھا--- وہی اسپارٹکس جسے بغاوت کے جرم میں ہلاک کر دیا گیا تھا--- وہی اسپارٹکس کہ جو اپنے وقتوں کا بہادر اور جری گلیڈی ایٹر تھا--- ہاں یہ بچہ اسی خاندان سے ہے مگر کسے معلوم کہ سچ کیا ہے، کون جانتا ہے کہ وقت کی دھند کے پرے کیا ہوا تھا--- تمہیں آج سننا پڑے گا، آج صرف سننے کا دن ہے تمہارا--!!---''

راہب اعظم کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی

''ہزاروں سال قبل جنوری کی ایک چمکیلی صبح تھی---''

راہب اعظم کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی چھلک آئی

''آج بڑا مقابلہ ہے کلوسیم میں، سپائیکلس لڑے گا آج خونی شیر سے''

چربی سے روشن مشعل تھامے ہوئے قید خانے کے پہرے دار نے پاس کھڑے دوسرے پہرے دار سے سرگوشی کی

''ہاں--- اور سنا ہے کہ شیر تین دن سے بھوکا ہے، اس کی خوفناک دھاڑ اور غراہٹ میں پاگل پن جھلکنے لگا ہے--- دیوتا رحم کریں سپائیکلس پر---''

پہرے دار کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں رقصاں تھیں

''لوگ بے چینی سے منتظر ہیں اس مقابلے کے، تین ماہ سے کوئی مقابلہ جو نہیں ہوا تھا''

پہلے پہرے دار نے دبے لہجے میں کہا

"اچھا چپ کر جاؤ، کوئی سن نہ لے"

دوسرے پہرے دار نے خوفزدہ انداز میں پہلے کو گھر کا

سپائیکلس کا نام روم میں بہادری کی علامت بن چکا تھا، وہ ایک گلیڈی ایٹر تھا---اسپارٹکس کے خاندان کا گلیڈی ایٹر---ایک غلام--- محض تفریح کا ذریعہ --- کئی درندے اس کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکے تھے

وہ فاتحانہ انداز میں اکھاڑے میں اترتا، اس کے چہرے پر ایک پرسکون مسکراہٹ ہوتی جس میں زمانوں کے بھید چھلک رہے ہوتے تھے، اکثر وہ پہلے چند منٹوں میں ہی خونی درندے کو چیر پھاڑ دیتا تھا، وہ عوام میں بہادری کے لئے تو مقبول تھا مگر لوگ اس کا خون دیکھنا چاہتے تھے، اس کی تڑپتی لاش ان کے دل میں ٹھنڈک بن کر اتر سکتی تھی مگر ہر بار سپائیکلس ان کی امیدوں کا محل زمیں بوس کر دیا کرتا تھا، شاہی خاندان بھی درندے کی فتح چاہتا تھا مگر سپائیکلس ان کی خوشی کے لئے اپنا جیون داؤ پر نہیں لگانا چاہتا تھا، جیتنا اس کی زندگی کی ضمانت تھا، اسے ہر حال میں جیتنا ہوتا تھا، بہت طاقتور وجہ زندگی تھی اس کے پاس---!!

یہ جنوری کی ایک چمکیلی صبح تھی--- کلوسیئم میں انسانی اژدہام ٹھاٹھیں مار رہا تھا، وحشت زدہ چہرے--- چنگھاڑتے، جھاگ اڑاتے، درندگی سجائے ہوئے چہرے---خون دیکھنے کے لئے بے تاب چہرے---لاشوں پر تھرکنے کے انتظار میں بے کل چہرے---ایک ہی طرح کے ہزاروں چہرے کلوسیئم میں جمع تھے، وہ سپائیکلس کے خلاف نعرے لگا رہے تھے، انہیں علم تھا کہ آج بھی غلام جیت جائے گا مگر امید کی ایک کرن کے تحت وہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اس مرتبہ درندہ زیادہ خونخوار اور وحشی تھا، اکھاڑے کے ایک کونے میں شیر کا پنجرہ تھا، یہ ایک دیو ہیکل اور لمبے ڈیل ڈول والا درندہ تھا، اس کی آنکھوں میں غضب اور حرکات میں بجلی کے لپکتے کوندے سی پھرتی تھی، ایسی پھرتی جس میں بے چینی اور وحشت جمع تھی، پنجرے کے پاس ایک غلام کھڑا تھا جس نے دروازہ کھول کر دوڑ جانا تھا، مقابلہ شروع ہونے والا تھا، کلوسیئم تماشائیوں اور درندے کی چنگھاڑ سے لرز رہا تھا، شاہی خاندان بالکونی میں براجمان تھا، شہزادے، شہزادیاں اور بادشاہِ وقت شوقِ انتظار میں پہلو بدل رہے تھے۔

آخر وہ لمحہ آن پہنچا جب سپائیکلس اکھاڑے میں داخل ہوا

لوگوں نے اس پر تھوکنا اور آوازیں کسنا شروع کر دیں---سپائیکلس چمکیلے مسلز والا لڑاکا تھا جس کی رگ رگ سے توانائی اور زندگی پھوٹ رہی تھی، اس کا قد عام رومیوں سے ایک ہاتھ بلند تھا، اس کے ایک ہاتھ میں چمکدار تلوار تھی، سر پر حفاظتی خول تھا، سینے کے گرد آہنی لباس اور بائیں ہاتھ پر نوکیلا دستانہ تھا، وہ ڈھال استعمال نہیں کرتا تھا، اسے معلوم

تھا کہ ڈھال صرف ایک نفسیاتی حوصلہ ہوتی ہے، ڈھال درندے کی ضرب کو روک نہیں سکتی، اس وقت سپائیکلس کی آنکھوں میں مخصوص فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ رہی تھی، وہی مسکراہٹ جس سے لوگ چڑتے تھے، اسے معلوم تھا کہ ہر کوئی اسے گرا ہوا، بکھرا ہوا دیکھنا چاہتا ہے، اس کی خون میں لت پت لاش جانے کتنی آنکھوں میں ٹھنڈک بن کر اترے گی، وہ ہارنے سے پہلے نہیں ہارنا چاہتا تھا، وہ جینا چاہتا تھا-- کیونکہ اس کے جینے کی ٹھوس وجہ موجود تھی----- اس وجہ سے اس کے چہرے پر مہربان اور حوصلہ بھری مسکراہٹ ہوتی تھی

وہ اکھاڑے میں تنہا کھڑا تھا

بادشاہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور غلام نے پنجرے کا ہک کھول کر دوڑ لگا دی

شیر ایک جست لگا کر باہر آیا اور ہوا میں زقند بھر کر سپائیکلس پر حملہ کیا جیسے اسے معلوم ہو کہ یہی وہ شخص ہے جس کو زیر نہ کرنے کا مطلب موت ہے---یوں لگتا تھا جیسے موت ہوا میں تیرتی ہوئی چلی آ رہی ہو، تماشائیوں کے منہ سے لذت بھری چیخ نکلی، درندہ واقعی جلدی میں تھا، بھوک نے اس میں وحشت بھر دی تھی

سپائیکلس نے آخری لمحے میں زمین پر لڑھکنیاں کھا کر شیر کے ابتدائی حملے کو ناکام کیا، درندہ ایک دھاڑ کے ساتھ زمین پر گرا اور پلک جھپکنے میں کھڑا ہو گیا، اس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی، نوکیلے دانت ادھ کھلے منہ سے جھانک کر خوف پیدا کر رہے تھے، دونوں حریف پھر آمنے سامنے تھے، شیر کی دم بے چینی سے ہل رہی تھی، وہ عام شیروں سے دوگنی جسامت رکھتا تھا

شیر نے اس بار ہوا میں چھلانگ لگانے کے بجائے سپائیکلس پر براہ راست حملہ کیا، قریب تھا کہ اس کے دائیں پنجے کا وار سپائیکلس کا شانہ ادھیڑ دیتا کہ غلام لڑکے نے پہلو بچاتے ہوئے شیر کی گردن پر تلوار سے وار کیا جو اچٹتا ہوا شیر کی بالوں بھری گردن پر محض خراش ہی ڈال سکا، کلوسیم شیر کی دھاڑ اور تماشائیوں کی مغلظات سے گونج اٹھا، لوگ سپائیکلس کی لاش دیکھنا چاہتے تھے، شاہی بالکونی میں بھی بے چینی شروع ہو چکی تھی

سپائیکلس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح بے پروائی تھی جو تماشائیوں کو بھڑکا رہی تھی

سپائیکلس کو یوں لگا جیسے ایک درندہ اکھاڑے میں اور ہزاروں باہر ہیں--- وہ درندوں کے درمیان گھرا ہے، ہر کوئی اس کی موت چاہ رہا تھا، سبھی اس کی بوٹیاں نوچنا چاہتے تھے--- شیر ایک بار پھر ہوا میں چھلانگ لگا چکا تھا، وہ سپائیکلس کو روند دینا چاہتا تھا---!!

سپائیکلس نے اپنی تلوار سیدھی کی، وہ اس کھیل کو اسی لمحے ختم کر دینا چاہتا تھا، اسے معلوم تھا کہ بس اگلے لمحے وہ فاتح ہو گا --- ہمیشہ کی طرح!!

اچانک بالکونی کی طرف سے ایک وحشت

بھری آواز سنائی دی ----ایک نسوانی آواز، جنون میں ڈوبی ---!!

"مر کیوں نہیں جاتے تم نیچ انسان---"

سپائیکلس نے حیرت سے بالکونی کی طرف دیکھا، ایک لمحے کو اس کی نظریں اس دلکش وجود پر پڑیں---یہ شہزادی ٹریشا تھی---رنگ، ادا، خوبصورتی اور حسن کا شاہکار---اس وقت بے چینی سے مٹھیاں بھینچے اپنی نشست پر کھڑی ہو چکی تھی، اسی نے سپائیکلس کو الفاظ کا کوڑا مارا تھا---!!

سپائیکلس جیسے پتھر کا ہو چکا تھا، اس کی تمام حسیات اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں، تلوار والا ہاتھ ہوا میں ساکت تھا---یہ بات ان ہونٹوں سے نکلی تھی جو اس کے لئے وجہ زندگی تھے، وہ جیت سکتا تھا مگر وہ جیتنا نہیں چاہتا تھا، اس کی آنکھوں میں درد سمٹ آیا، وہ محبت اس کی آنکھوں سے لہو بن کر بہہ رہی تھی جو اس نے شہزادی ٹریشا سے چپکے چپکے کی تھی---خاموش محبت---وہ تو اس کے لئے جیتا کرتا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ شہزادی باقیوں جیسی نہیں ہے، شہزادی اس کو جیتا دیکھنا چاہتی ہے، شہزادی اس کی ہر فتح پر خوش ہوتی ہے---مگر آج اس پر انکشاف ہوا کہ شہزادی درندے کے ساتھ ہے، شہزادی اس کی لاش دیکھنا چاہتی ہے، شہزادی اس وحشی مجمع کے ساتھ ہے---وہ تو غلام ہے اور غلام تنہا ہوتے ہیں---وہ ساکت کھڑا تھا---یہ ایک لمحہ تھا، اس لمحے میں جیسے شہزادی نے بھی اس کی آنکھوں کا کرب پڑھ لیا تھا، شہزادی کرسی پر ڈھے سی گئی---!!!

تو فیصلہ ہو چکا تھا، اس ایک لمحے نے فیصلہ کر دیا تھا---شیر ایک دھاڑ کے ساتھ لڑا کا غلام پر گرا---اس کا ہاتھ اسی طرح فضا میں ساکت تھا اور نگاہیں بالکونی پر جمی تھیں، اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی، سینکڑوں درندوں کو ایک لمحے میں موت کے منہ پہنچانے والا خاموشی سے پیچھے ہٹ چکا تھا۔

تماشائیوں کے منہ سے چیخ نکلی---اس چیخ میں مسرت نہیں بلکہ درد تھا، کرب تھا اور تڑپ تھی---روم کے بہادر گلیڈی ایٹر نے جان دے دی---محبت پر جان دے دی---وہ یہ تو نہیں چاہتے تھے، وہ سپائیکلس کو مقابلہ کرتے دیکھنا چاہتے تھے مگر وہ کس کے لئے لڑتا---اس کی موت تو اس نے مانگی تھی جو وجہ زندگی تھی---!!

سپائیکلس کی بکھری لاش کے گرد سسکیوں کی گونج رقص کر رہی تھی

کلوسیم میں سسکیاں گونج رہی تھیں، راہب اعظم کی سسکیاں---عوام کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی سسکیاں، جیوری اور شاہی خاندان کی سسکیاں!!

مجمع سر سے ہیٹ اتار کر ننھے مہمان کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو چکا تھا---عدم آباد میں سپائیکلس کی روح مسکرا رہی تھی!!!

☆☆☆☆☆

فیمنسٹ

صبا ممتاز بانو

سرد موسم پوری جولانی پر تھا۔ اس کے اردگرد ٹھنڈی ہوائیں رقص کر رہی تھیں اور ہر طرف یخ بستہ رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ حرارت صرف ان ڈبوں میں مقید تھی جو زمین پر دیواروں اور چھت سے بنے تھے۔ ان چھوٹے بڑے ڈبوں میں بھی کئی ڈبے تھے جن میں ہیٹر دہک رہے تھے، انگیٹھیاں جل رہی تھیں اور عاشقوں کی موج مستیوں سے رضائیاں مچل رہی تھیں ۔ باہر تو صرف وہ لوگ تھے جن کی ضرورتوں اور مجبوریوں نے انہیں سرد موسم میں دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا تھا یا وہ پھر وہ منچلے جو موسم کو چھیڑنے کے لیے نکلے تھے۔

صلہ کی مجبوریوں نے بھی رات سے اس کے سر میں اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گرم سوٹ کے اوپر کالا عبائعہ اور کالے عبائعے کے اوپر ایک لمبا کوٹ پہن کر گھر سے نکل پڑی ۔ اس کے تیز تیز قدموں سے راستہ بھی دہائی دینے لگا۔ تیز تیز چلنے کی وجہ سے اس کا جسم گرم ہو چکا تھا لیکن جہاں جہاں اس کے قدم پڑے تھے، وہاں وہاں زمین ابھی بھی درد سے کسمسا رہی تھی۔

گھر سے نکلتے ہی ایک مرصع تاج بھی اس

کے سر پر چمکنے لگا۔ جس پر کئی ڈوریاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس تاج کو اس نے سر سے اتارنے کی خواہش تو کی تھی لیکن جونہی وہ اسے اتارنے کی کوشش کرتی تو دہشت ناک آوازیں اور ہیبت ناک چہرے اس کے اردگرد دائرے میں رقص کرنے لگتے کہ وہ اس خیال کو یکسر ترک کر دیتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے جونہی اس دائرے سے باہر قدم نکالا۔ یہ سب اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔

صلہ نے اپنے سرد ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ اپنے سر کو پوری طرح سکارف میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس وقت صرف اس کا چہرہ یا ہاتھ ہی ننگے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان دونوں موروثی تحفوں میں معاملہ ضد کا تھا۔ سڑک پار کرتے ہی وہ ایک ایسی گلی میں جا پہنچی جو اب پرانی دکانوں کا مرکز بن چکی تھی۔ اس گلی کے آغاز میں شہر کا ایک بڑا پولیس مرکز بھی تھا جس میں ہر وقت پولیس ملازم اور عوام کا ہجوم رہتا۔ چند فوٹو سٹیٹ والے، پرانی کتابوں کی دکانیں اور ایک چائے والا جو سارا دن تھانے اور دکانوں والوں کو چائے بھیجتا رہتا۔

چائے خانے سے پہلے اس کی ایک چھوٹی سی سٹیشنری دکان تھی پھر کسی سیانے نے اسے مشورہ دیا کہ اب لکھنے پڑھنے والے لوگ کہاں، دکان کے اگلے حصے میں چائے خانہ کھول لو۔ زیادہ کماؤ گے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور اس دن کے بعد سے اب تک وہ بے کار نہیں بیٹھا۔ سب سے زیادہ چائے اس سے راج منگواتا تھا۔ راج جو ایک فلسفی تھا، ایک شاعر تھا اور ایک بکس سیلر۔۔۔

اس گلی میں ایک متکبر ناشر بھی تھا۔ ہاں، وہی جس نے صلہ کی کتاب چھاپنے کے عوض اسے رائلٹی کی پیش کش کی تھی لیکن بدلے میں باتوں باتوں میں اس کے جسم کی تمنا بھی کی تھی اور باتوں باتوں میں ہی صلہ نے انکار بھی کر دیا تھا۔ کچھ عرصے بعد شنید ہوئی کہ اپنے غرور اور غلط فیصلوں کے باعث وہ دیوالیہ ہو گیا۔ گلی اس کے ناپاک وجود سے خالی کیا ہوئی۔ شہر بھر کے پرانی کتابوں کے سیلز مین یہاں آ کر بیٹھ گئے۔

تیز تیز چلنے والی صلہ کے قدم ہمیشہ اس گلی میں آ کر آہستہ ہو جاتے کیونکہ یہاں ہر دو قدم کے فاصلے پر کتابوں کی کشش اسے روک لیتی۔ کئی دکانوں پر رکتے اور ٹھہرتے ہوئے وہ اس پر ہجوم گلی میں بہت سارے مردوں کے درمیان شان بے نیازی سے ایک ملکہ کی طرح چلتی ہوئی راج تک آ پہنچی تھی۔ بلاشبہ وہ حسین تھی۔ اونچا لمبا قد، کسرتی جسم، مخمور آنکھیں، تیکھا ناک جس پر نہیں لگتا کہ اس نے کبھی مکھی بیٹھنے دی ہو گی، بھرے بھرے ہونٹ جو سردی سے تھرتھرا رہے تھے۔

"مجھے پنجابی کی ڈکشنری چاہیے۔" اس نے اپنی نشیلی آنکھیں راج پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو میرے پاس نہیں لیکن میں تلاش کر سکتا ہوں، آپ مجھے دو دن کا وقت دے دیجیے۔ وہ میرے پاس گودام میں رکھی ہو گی۔" راج نے صلہ کی طرف اشتیاق بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

سچ تو یہ ہے کہ بارہ سال سے کتابوں سے جڑے شخص کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خزانے میں کون سی کتاب ہے یا نہیں لیکن پسندیدہ چہرہ انسان کو کمزور کر دیتا ہے۔ کوئی نادیدہ قوت راج پر حاوی ہو گئی جس نے اسے کتاب کے ملنے کی امید دی۔ کتنی ہی کتابوں کی بوریاں روز تو گودام میں آتی جاتی تھیں۔ شاید اسے مل ہی جائے۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو پنجابی کی ڈکشنری کس لیے چاہیے۔"

"جی، وہ میں پنجابی میں شاعری کر رہی ہوں تو مجھے اوزان کے لیے الفاظ کو دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"تو آپ پنجابی میں شاعری کرتی ہیں۔" راج مسکرایا۔ یہ تو اس کے ہی قبیلے کی تھی۔

"شاعری تو اردو میں کرتی ہوں، افسانے لکھتی ہوں۔ مگر اب پنجابی کا شوق چڑھا ہے۔"

"میں بھی شاعر ہوں لیکن آزاد شاعر، یہ دیکھیں میری شاعری کے نمونے۔ میری ایک ادبی تنظیم بھی ہے جس کے تحت میں سو سے زائد تقریبات کر چکا ہوں۔"

راج نے جھٹ سے موبائل اس کے سامنے کر دیا، جس میں اس کی شاعری اور ادبی تنظیم کا پیج بھی تھا اور مختلف اخبارات میں چھپنے والی شاعری کے نمونے بھی۔

"کیا آپ اس منجمد زدہ سردی میں میرے ساتھ ایک کپ چائے پینا پسند کریں گی۔"

اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے راج بخت کو دیکھا، ایک چالیس سالہ کمزور، ناتواں شخص، جس کی داڑھی دیکھ کر اس کے سکھ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

اس دن کی چائے کا سفر دوستی پر منتج ہوا۔ چائے میٹھی تھی لیکن راج بخت کی باتیں اس کے لیے کڑوی۔

وہ خدا کے وجود کا قائل نہیں تھا۔ وہ مذہب کو ذہین فطین لوگوں کی اختراع سمجھتا تھا۔ وہ سکھ مذہب کے بانی گرونانک سے متاثر تھا۔ وہ زمین کو خدا مانتا تھا۔ زمین جو انسان کو خوراک سے لے کر پناہ تک دیتی ہے۔ اس کی باتوں میں ایسی منطق اور دلائل تھے کہ کسی ضعیف العقیدہ شخص کو ملحد کر سکتے تھے۔ کئی بار اس کا تاج بھی لڑکھڑایا لیکن اس کے ساتھ بندھی ڈوریوں نے اسے گرنے نہیں دیا۔

صلہ اور راج بخت کی زندگی میں کچھ بھی مشترک نہیں تھا۔ صلہ ایک خانماں برباد عورت تھی۔ اس کا شوہر عورتوں کا رسیا تھا جس نے کبھی اپنے کندھوں پر ذمہ دار چڑیا کو بٹھایا ہی نہیں تھا۔ اس کی ان حرکتوں کی وجہ سے اب صلہ نے اسے اپنی زندگی سے

ہی اڑا دیا تھا۔ زندگی کا بوجھ شوہر کی بے وفائی کے بوجھ سے بہت کم تھا۔

کتابوں کے شوق نے راج بخت کو سرکاری اور نجی ملازمتوں کو ٹھکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ نصابی کتابیں اس نے بیرونی الماریوں میں سجا رکھی تھیں اور ادبی، سماجی و دیگر اور نایاب کتابیں اس کے اوپر والے گودام میں رکھی تھیں۔

"صلہ تم میری کتابوں کا آن لائن بزنس سنبھال لو، میں روزانہ کی فروخت میں سے پندرہ فیصد تمہیں دیا کروں گا۔ تمہیں بس سوشل میڈیا پر کام کرنا ہوگا۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" صلہ نے اس خزانے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے اس کا فیس بک پر پیج بنا رکھا ہے۔ انسٹاگرام پر بھی انہیں فروخت کرتا ہوں۔ میں نے اس کا ایک فیس بک اور واٹس ایپ گروپ بھی بنا رکھا ہے جس کا میں تمہیں ایڈمن بناؤں گا۔ وہاں پر روزانہ کی بنیاد پر تم دس پندرہ کتابوں کی تصویریں بنا کر لگاؤ گی۔ پھر جو آرڈر آئے گا۔ میں انکی قیمت تمہیں بتاؤں گا اور تم انہیں بتاؤ گی۔ جب وہ میرے اکاؤنٹ میں پیسے بھیجیں گے تو میں کتاب پوسٹ کر دوں گا۔"

اس نے چھوٹے بچوں کی طرح اسے ایک ایک بات سمجھائی۔

"ٹھیک ہے، کام اتنا مشکل نہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں، یہ کام بہت مشکل ہے۔ کئی لوگ بلاوجہ تم سے گفتگو کریں گے۔ تمہیں اس کتاب کے مندرجات کی تصویر بنا کر بھیجنے کو کہیں گے۔ کئی اس کے عنوانات کو لے کر بات چیت شروع کر دیں گے۔ تمہیں سکون سے بیٹھنے کا کوئی لمحہ نہیں ملے گا۔ صرف اتنا ہی نہیں، کئی لوگ تمہارا تاج بھی اتارنے کی کوشش کریں گے۔" اس کی آخری بات نے صلہ کو چونکا دیا۔

"کیا ان کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں۔؟ یہ میرا خاندانی تاج ہے۔ اسے اتارنا اتنا آسان نہیں۔ اب تو یہ سیمنٹ کی طرح پختہ ہو چکا ہے۔ اس تاج کی حفاظت فرشتے کرتے ہیں۔ مجھے اس کی کوئی فکر نہیں، بس مجھے زیادہ لوگوں سے بات چیت یا رابطے سے الجھن ہوتی ہے مگر ضرورت انسان کو پھٹا ہوا لباس بھی سی کر پہننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اپنی گفتگو کو رسیلا اور بدن کو لچکیلا بنانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ضرورتوں کے جنازے تو اٹھانا ہی پڑتے ہیں۔ لمحہ موجود میں ہونا بھی ایک نعمت ہوتی ہے۔ میں اس نعمت سے فیض یاب ہونا چاہوں گی۔"

"ان کے ہاتھ تمہاری سوچ سے بھی لمبے ہیں۔ تم خود اپنا تاج اتارنے پر راضی ہو جاؤ گی۔ اس تاج کی حفاظت فرشتے نہیں، تمہارے اندر کی انا کرتی ہے بھولی صلہ۔ جس دن یہ انا ٹوٹ پھوٹ گئی۔ یہ تاج خود ہی ہواؤں میں اڑ جائے گا۔ خیر چھوڑو، کام کی بات کرتے ہیں۔ میں اس کے لیے تمہیں اپنی سم دوں گا،

گیارہ بجے دن سے شام چار بجے تک تم کام کرو گی۔ دوپہر کا کھانا اور چائے میری طرف سے تمہیں میسر ہوگی۔ پہلے ایک لڑکی میرے پاس یہ کام کرتی تھی اور اس کے مہینے کے بیس تیس ہزار بن جاتے تھے۔ میں نے پیسوں کے معاملے میں کبھی ڈنڈی نہیں ماری تھی لیکن پھر وہ چلی گئی۔۔۔"

"اس نے کیوں چھوڑا۔" راج کے چہرے پر پھیلی اداسی نے اسے سوال کرنے پر مجبور کر دیا۔

"وہ بہت بولڈ تھی۔ چھوٹے چھوٹے کپڑے، کسی ہوئی جینز پینٹ، کٹے ہوئے بال اور آزادانہ لائف سٹائل۔ لیکن مجھے اس کے حلیے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ میری زندگی کی واحد عورت تھی جس نے مجھے متاثر کیا۔ اسے کتابوں سے عشق تھا۔ دنیا جہان کی کتابیں اس نے پڑھ رکھی تھیں۔ میں علی عباس جلال پوری پر بات کرتا یا سبط حسن پر، میرا موضوع میکسم گورکی ہوتا یا سارتر یا کارل مارکس یا پھر ٹالسٹائی، اس نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ میری ہی طرح رابندر ناتھ ٹیگور اور ن م راشد کی مداح تھی۔ اسے ملکی اور عالمی ادب ازبر تھا۔ وہ بے تکان اور بے ساختہ بولتی تھی۔ اس کا علم کئیوں کی بولتی بند کرنے کے لئے کافی تھا۔

ہم بہت اچھے دوست بن چکے تھے۔ ہم اکٹھے کتابوں کی سیر کرتے۔ ہم میں کئی حاصل اور لاحاصل باتیں ہوتیں۔ جن کا نچوڑ چاہے کچھ نہ نکلتا مگر سردیوں میں رم یا برانڈی اور گرمیوں میں واڈکا یا وہسکی پر تان ٹوٹ جاتی۔ وہ مردانہ ہارمونز کی مالک عورت تھی جسے چرس، شراب اور عورت کا نشہ تھا، وہ عورت کی قربت پسند کرتی تھی۔ وہ متوسط خاندان سے تھی۔ ملازمت وہ صرف اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے کرتی تھی۔ وہ اکثر چلتے چلتے میرے کولہوں پر چٹکی کاٹ دیتی تھی اور جب وہ ٹانگیں پھیلائے آرام دہ انداز میں زمین پر بیٹھی ہوتی تو میں کئی بار اس کی ٹانگوں پر لیٹ جاتا تھا۔"

"لیکن میں یہ سب نہیں کر سکوں گی۔" صلہ کے لہجے میں مایوسی در آئی۔

"ایک طرف جیا اتنی بولڈ، لبرل اور باشعور۔ دوسری طرف تم جسے شراب کا شوق ہے اور نہ سگریٹ کی عادت، جسے نہ چرس اچھی لگتی ہے اور نہ بے تکلفی" وہ صلہ کا موازنہ جیا سے کر رہا تھا۔

"جیا تو آپ جیسی تھی اور صلہ تو صرف اپنے جیسی ہے۔" صلہ نے خود پر زور دیا۔

"فکر نہ کرو، مجھے تم سے یہ سب نہیں چاہیے۔ تم دونوں میں ایک بات مشترک ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح عورت کی پاکیزگی کی قائل تھی لیکن صرف مردوں سے۔ اسے اپنے کنواری ہونے پر فخر تھا۔ باقی وہ ہر کام جائز سمجھتی تھی۔ جانے ان مشرقی عورتوں کا لبرل ازم سیکس کے معاملے میں کہاں چلا جاتا ہے۔"

"کیا وہ فیمنسٹ تھی۔" میرے ذہن میں ایک سوال گونجا۔

"دیکھو صلہ، ہر عورت میں ایک مرد بھی ہوتا ہے اور ہر مرد میں ایک عورت بھی ہوتی ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ تم فیمنسٹ کسے کہتی ہو مگر میرے خیال میں اپنے حقوق کی بات کرنے والی ہر عورت فیمنسٹ ہے۔ ہر عورت کو اپنی زندگی اپنے انداز سے جینے کا پورا حق ہے۔ یہی فیمنزم ہے۔ کچھ کے نزدیک آزاد روش فیمنزم ہے۔ کچھ کے نزدیک یہ جنگ جائز حقوق کی ہے۔ اس تحریک نے کئی پینترے بدلے ہیں اور ہر اک نے اسے اپنے اپنے انداز سے اپنایا ہے۔ جیا کا لباس، اس کا رہن سہن ضرور مغربی یا آزاد تھا مگر وہ مرد سے تعلقات کے معاملے میں ایک خالص مشرقی لڑکی تھی۔"

"کیا تعلقات تعلقات نہ ہونے کی وجہ سے خراب ہوئے۔" صلہ نے جاننا چاہا۔

"نہیں، وہ اوپر والے گودام میں اپنے دس بارہ دوستوں کو چھٹی ٹائم سے پہلے بلا لیتی تھی۔ وہ خوب ہنگامہ کرتے، کھاتے پیتے اور پھر نشہ بھی کرتے۔ میں اور جیا تین پیگ سے زیادہ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ جب وہ میرے ساتھ بالانوشی کرتی تو میں اسے تین پیگ سے آگے نہیں جانے دیتا تھا لیکن جب وہ دوستوں کے ساتھ ہوتی تو موج مستی میں چار پانچ پیگ پی لیتی۔ پھر اس کو ہوش میں لانا میرے لیے مشکل ہو جاتا۔ اس کے دوست اسے چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ میں اسکا نشہ ہرن کرنے کے لیے مختلف تدبیریں کرتا۔

ایک دفعہ وہ شراب کے نشے میں دھت تھی۔ اس نے مجھے کہا، "راج، میرے قریب آؤ، میری ضرورت کے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ آؤ، ایک دوسرے کے بدن میں اُڑان بھرتے ہیں۔"

میں اس کی بے ہوشی سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے جیسے تیسے کر کے گودام سے نکالا۔ اسے اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بٹھایا۔ راستے میں ایک پٹھان بچے سے قہوہ پیا۔ فورٹریس میں ایک ہوٹل میں کافی منگوائی۔ سرد سرد ہوا اور گرم گرم کافی نے اس کا نشہ اڑا دیا۔

"سنو، اب بتاؤ، جو تم چاہو گی۔ میں کروں گا۔"

"نہیں۔ نہیں۔ بس راج مجھے اب گھر جانا ہے۔"

ہوش میں آنے کے بعد اسے اپنی دوشیزگی قائم رکھنے کی فکر ستانے لگی تھی۔ میں اسے بہت پسند کرتا تھا۔ شاید اپنی خوش بختی پر نازاں بھی ہوتا لیکن جب وہ اپنے ہوش و حواس میں ہی نہیں تھی۔ میں یہ زیادتی کیسے کر سکتا تھا۔

"لیکن پھر آپ دونوں میں علیحدگی کیوں ہوئی۔" صلہ نے پھر وہی سوال داغا۔

"میں اسے کبھی بھی نہ چھوڑتا لیکن پوری

مارکیٹ ان کے ہنگامے کو لے کر باتیں کرنے لگی تھی۔ ایک طرف مذہبی لوگ تھے اور دوسری طرف ٹھرکی۔ مذہبی اسے کنجر سمجھ کر نکالنے پر مصر تھے جب کہ ٹھرکی انہیں کنجر سمجھ کر گلے لگانے کے متمنی تھے۔ مذہبیوں نے میرے گودام کا نام کنجر خانہ رکھ دیا تھا، تماش بینوں نے عیاشی کا اڈہ اور لبرلوں نے کلب۔ اب بولو، میں کیا کرتا؟ میں لبرل اور بولڈ ہونے کے باوجود اس معاشرے کی اخلاقی اقدار کو توڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔"

"آپ اسے سمجھا دیتے تو وہ سمجھ ہی جاتی۔"

"وہ میری بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ کہتی تھی کہ مجھے معاشرے کی پروا نہیں۔ میں کہتا تھا کہ تمہیں نہ ہو مگر مجھے تو ہے۔ پھر بات صرف یہی تک نہیں رہی تھی۔ وہ مجھ سے شادی کی خواہش کرنے لگی تھی"

"راج میں تم جیسی ہوں اور تم مجھ جیسے۔ پھر کیوں ہم ایک نہیں ہو جاتے، یہاں تم جیسے کتنے ہیں جنہیں فرائڈ از بر ہے۔ جن کو تاریخ مذہبیات سے جنسیات تک کا علم ہے۔ راج میں کسی اور کے ساتھ رہی تو مر جاؤں گی۔ یہاں مذہبی لالچیوں، فسادیوں اور ٹھرکیوں کا راج ہے۔ یہاں لبرل تماش بین عورت سے کھیلتے ہیں۔ کون مجھ جیسی بیوی چاہے گا جو شراب پیتی ہے اور چرس سے عشق کرتی ہے بھلے وہ خود نشے کا سوداگر ہو۔۔"

"جیا، میں تمہاری عیاشانہ اور آزادانہ زندگی کا کیسے متحمل ہو سکتا ہوں۔ تم ایک اچھے گھر کی لڑکی ہو۔ تمہارا گھر میرے گھر سے بہتر ہے۔ پھر میں معاشرے سے کٹا ہوا آدمی نہیں ہوں۔ میں معاشرے کا رسوم رواج کا قیدی ہوں اور اس جیل سے باہر نکلنا میرے لیے ممکن نہیں۔"

"ارے، میں انگلش میں ماسٹر کر رہی ہوں، اپنا خود کما لوں گی۔ تمہارے بیوی بچوں کو بھی پال لوں گی۔ زندگی ہماری ہے، لوگوں کی نہیں۔"

"واہ، آپ کے لیے اسے مستقل طور پر اپنانے کا ایک سنہری موقع تھا۔" صلہ کو مذاق سوجھا۔

"مگر مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس معاشقے کی اُڑتی اُڑتی خبریں میری گھر والی تک بھی پہنچ چکی تھیں۔ ایسی عورت جو دن رات میرے اور میرے بچوں کا خیال رکھتی تھی۔ جس نے اپنا شباب مجھے راضی کرنے میں دان کر دیا تھا۔ جس نے اپنی توانائی اور طاقت کو داؤ پر لگا کر میرے بچوں کو جنم دیا تھا۔ جس نے ساری ساری رات میرے بچوں کو جاگ کر پالا تھا۔ وہ کبھی اسے برداشت نہ کرتی۔ میں ایک خالص فیمنسٹ مرد اسے دکھ کیسے دے سکتا تھا۔"

راج اور جیا کی ادھوری کہانی میں اگلا قدم جیا نے رکھا تھا۔ گودام میں اب صلہ نے جیا کی جگہ لے لی تھی۔

سارا دن کتابوں کی چھانٹی کرتی۔ ان کی تصویریں بنا کر اپ لوڈ کرتی۔ دوپہر کے

کھانے کے وقت صلہ اور راج بخت تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتے۔ کسی نہ کسی موضوع پر بات چھڑ جاتی۔ یونہی ایک دن پامسٹری پر بات چھڑ گئی۔ صلہ نے اپنے ہاتھ راج کے سامنے پھیلا دیے۔

"میرے ہاتھ دیکھو راج، یہ کیا کہتے ہیں، میری زندگی کے مسائل کبھی حل بھی ہوں گے یا نہیں۔"

"میں تو پہلے دن سے تمہارے ہاتھ دیکھ رہا ہوں۔ بہت خوب صورت ہاتھ ہیں۔ میں نے ایسے ہاتھ کسی عورت کے نہیں دیکھے صلہ۔"

صلہ نے اپنے قدرے مرد نما سخت اور کھردرے ہاتھوں کو دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"راج، کیا تم صرف اپنی بیوی کے لیے فیمنسٹ ہو، کیا میں عورت نہیں۔؟"

راج نے صلہ کے ہاتھوں کو پکڑ لیا اور پیار سے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا، "صلہ تمہیں وراثت میں یہ ہاتھ ملے اور قسمت میں محنت۔ جس نے تمہارے ان ہاتھوں کو کبھی سنورنے ہی نہیں دیا۔ تمہارے ہاتھ پاؤں تمہاری مشقت کی تاریخ کے گواہ ہیں۔ یہ ہاتھ بتاتے ہیں کہ تم نے زندگی میں کتنی محنت کی ہے۔ یہ ہاتھ ایک محنتی عورت کے ہیں۔ مجھے ان ہاتھوں سے محبت ہے۔"

راج اس دنیا میں وہ واحد شخص تھا جس کو صلہ کے ہاتھوں سے محبت تھی۔ اسے ہاتھ دیکھنا نہیں آتے تھے۔ لیکن اسے ہاتھوں کی ساخت سے طرز زندگی کا پتا چل جاتا تھا۔ وہ تو آنکھوں اور باتوں سے اندر کی نفسیات کو بھی جانچ لیتا تھا۔ اس نے تو اس کے سر پر اس مرصع تاج کو بھی دیکھ لیا تھا جو کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔

ایسے ہی ایک لمحہ بازیافت میں اس نے صلہ کو اپنے بدن پر تسلط اور کسی کو سپردگی کی نفی کا نفسیاتی کھرا صلہ کی خود پرست انا میں تلاش کر لیا تھا۔ سچ ہی تو تھا، صلہ کے نزدیک کسی کو اپنا بدن پیش کرنا اپنی ہی بے توقیری تھا۔ اپنے آپ سے محبت اسے دوسروں سے دور رکھتی تھی۔ وہ کیسے اپنے اس انمول جسم کو کسی کے لمس سے آلودہ کر سکتی تھی۔ ایسی ویسی ہوتی تو سارا دن سوشل میڈیا پر کتابیں نہ بیچتی۔

"صلہ، ہفتے میں ایک دن ہم فیس بک اور واٹس ایپ پر لائیو کتابیں فروخت کرتے ہیں۔ ہم ایک ایک کتاب پکڑیں گے۔ اس کا ٹائٹل، مندرجات دکھائیں گے۔ اس کی خصوصیات پر بات کریں گے۔ ہاں اس دوران لوگ ہمیں براہ راست دیکھیں گے، ہم سے سوالات کریں گے۔ ہم سے بات چیت کریں گے۔ ہمیں ایک کامیاب اور اچھے سیلز مین کی طرح مسکراتے ہوئے ان کا سامنا کرنا ہے اور ان کو اپنی کتابیں خریدنے پر آمادہ کرنا ہے۔ پہلی دفعہ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ پھر تم اکیلی لائیو جاؤ گی۔"

صلہ نے چہرے پر جھکے بالوں کو اپنے ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے راج کی طرف دیکھا۔ دونوں ایک

دوسرے کی ضد تھے، معصوم بھولا بھالا نرم و گرم چہرہ اور سخت کھردرے ہاتھ--- وہ مسکرایا، اسے تو دونوں ہی اچھے لگتے تھے۔

پھر ہفتے کا وہ دن آ ہی گیا جب انہیں واٹس ایپ گروپ پر لائیو جانا تھا۔ ویڈیو کیمرہ آن ہو چکا تھا۔ راج گودام کے درمیان میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے گروپ ممبرز کو تمام گودام کی سیر کرائی۔ ایک ایک الماری میں رکھی کتابوں پر کیمرہ ڈالا۔ پھر نئی آنے والی کتابوں سے متعارف کرایا۔ ایک پرانی کتاب کی قیمت راج نے تین ہزار بتائی۔

صلہ منتخب شدہ کتابوں میں سے ایک ایک کر کے راج کو کتاب پکڑاتی جاتی۔ گروپ کے سب لوگ پوری دلچسپی سے معلومات لے رہے تھے۔ پھر گروپ میں سے ایک شناسا سا چہرہ صلہ ہاتھ ہلاتا ہوا نظر آیا، ہاں وہ جیا تھی، راج کی دوست، اس کی ہم پیالہ، ہم نوالہ، اس کی رازدار اور اس کی لاحاصل محبوبہ۔ شاید راج نے بھی جیا کو دیکھ لیا تھا۔

ویڈیو سیشن ختم ہو گیا۔ بے چین راج نے برانڈی کی بوتل نکالی اور منہ کو لگا لی۔ کسی اپنے کو چھوڑ دینا جان پر کھیل جانے کا نام ہی تو ہے۔ پھر چاہے سولی سے لٹک جاؤ یا زہر حلق میں اتار لو۔ گھونٹ گھونٹ شراب بھی تو جی کو مار ڈالتی ہے۔

''راج۔ زیادہ تر تو نصابی کتابیں ہی فروخت ہوتی ہیں۔ پھر تم پرانی کتابیں کیوں خریدتے ہو۔ یہ تو بہت کم فروخت ہوتی ہیں۔'' صلہ نے راج کی حالت کو دیکھتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''نصابی کتابوں سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ اصل دیہاڑی تو ان کتابوں سے لگتی ہے۔ اس میں بہت سی کتب اب شائع ہی نہیں ہوتی ہیں یا پھر بہت مہنگی ہیں۔ میں ان کتابوں کی درج قیمت نہیں لیتا بلکہ ان کی قیمت ان کی قدر و قیمت کے حساب سے خود لگاتا ہوں۔ پھر اس نے موبائل میرے سامنے کر دیا،

ایک پرانی کتاب کے تین ہزار اس کے موبائل اکاؤنٹ میں پہنچ چکے تھے۔

ایک اور کتاب کے ہزار روپے بھی آ چکے تھے--

''ابھی رات تک بہت سے پیسے آ جائیں گے۔ کل میں ان تمام آرڈرز کو پوسٹ کر دوں گا۔ پھر میں کئی اداروں کی لائبریریاں بھی سیٹ کرتا ہوں۔ اس میں بھی اچھا خاصا کما لیتا ہوں۔''

چھوٹے چھوٹے کاموں کے بھی کئی راز ہوتے ہیں جو ان کی تہہ میں اتر کر ہی پتا چل سکتے ہیں۔ کسی نے سچ ہی تو کہا ہے کہ سمندر کی گہرائی کا اندازہ کنارے پر کھڑے ہو کر نہیں لگایا جا سکتا۔ دلوں کے بھید ان میں اتر کر ہی پتا چلتے ہیں۔

اگلا ہفتہ آ گیا۔ صلہ کو اکیلے لائیو جانا تھا۔ اس نے کتابوں کو ترتیب سے رکھا اور ویڈیو کیمرہ آن کر دیا۔ سیشن جاری تھا۔ کبھی اس کے ہاتھ

ایک کتاب کو پکڑتے اور کبھی دوسری کو۔ کئی دفعہ اسے اپنے ہاتھوں سے اپنا دوپٹا ٹھیک کرنا پڑتا جو کبھی سینے اور کبھی سر سے بغاوت کرنے لگتا۔ کسی کی بے باک نگاہ اسے اندر تک چیر کر رکھ دیتی۔ وہ اپنے تاج کو سنبھالتے ہوئے اپنا کام سرانجام دیتی رہتی۔

"پھر جیسے دھیمی سی کوئی آواز، بڑے بڑے ہاتھ ----

اوہ، آپ کتنی پیاری ہیں مگر یہ ہاتھ ----------"

اس نے ان آوازوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سیشن مکمل کیا۔ اس کا سر بہت درد کر رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر اس کے ہاتھوں پر گر گئے۔

ہفتے کا ایک دن اس کے لیے قیامت ہوتا مگر حالات کی ستم گری اور راج کی تعریف کا سوچ کر اس قیامت سے گزر جاتی۔

"تمہارے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں صلہ، مجھے ان سے محبت ہے۔" یہ سوچ کر وہ تسلی دے لیتی کہ کوئی تو تھا جس کو اس کے ہاتھوں سے محبت تھی۔ اسے تو اپنے تاج سے محبت تھی۔ یہاں اس کا تاج محفوظ تھا۔ اتارنے والے ہاتھ بہت دور تھے۔ بس باتوں کے تیر اسے چھلنی چھلنی کر دیتے تھے۔

"صلہ، کیا تم اس کام سے خوش نہیں، تمہارا چہرہ اتنا مرجھایا سا کیوں رہنے لگا ہے۔"

"نہیں راج، بس موسم بدل رہا ہے نا، اس لیے ----"

اسے تو بچپن سے ہی قیامتوں کو چھپانے اور حادثوں میں چھپنے کی عادت تھی۔ ایک تناؤ ہی تو تھا۔ کچھ دیر کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔

لائیو ویڈیو کے دوران اکثر جیا کا چہرہ بھی دیکھنے کو ملتا تھا جس پر دعا اور امید کا ہالہ چمک رہا ہوتا تھا۔ اس لمحے ایک بھوتنی اس کے اندر ضد کرنے لگتی کہ وہ راج کو گھسیٹ کر گودام میں لے آئے اور جیا کے دربار محبت میں پیش کر دے۔ ایک جھلک عاشق کا حق ہوتی ہے۔

دن رات ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ سورج چاند بھی مقابل تھے۔ جیا اور صلہ بھی ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں۔ جیا کو راج سے محبت تھی اور صلہ کو راج سے غرض۔ رہا راج تو اسے دونوں سے محبت تھی۔ وہ جیا سے سلام دعا بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا مگر صلہ کو ہمیشہ کے لیے دوست رکھنے کا خواہش مند تھا کیونکہ صلہ اس کی بیوی کے مقابلے پر نہیں کھڑی تھی۔ وہ اپنے ہی عشق میں گرفتار ایک بے چین روح تھی۔

صلہ راج کی طرح کہنہ روایات کی قیدی تھی جن میں بھلے روح کی سانس بھی نہ نکلے، گھٹ گھٹ کر اندر کے انسان کی موت واقع ہو جائے لیکن روایات زندہ رہتی ہیں اور قیدی روایات کے اندھے کنوئیں میں مدفن ہو جاتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ڈپریشن بڑھ جاتا، صلہ اپنی

ایک ماہر نفسیات دوست کے پاس جا پہنچی۔
"صلہ، خوش باش رہنے کے لیے انسان کو اس دنیا کے معیارات سے نہیں، خود کو اپنی نظر سے دیکھنا ہوگا۔"
اس کی ایک سائیکالوجسٹ دوست فوزیہ نے اسے ڈپریشن سے نکالنے کی کوشش کی۔ وہ جانتی تھی کہ صلہ اس کے پاس اس وقت آتی تھی۔ جب وہ کسی غم کو لاشعور کی گہری قبر میں دفن کرنا چاہتی تھی یا جینے کے لیے کسی کی تائید کی متلاشی ہوتی تھی۔ کسی بے وفا محبوب کو نذر آتش کرنا چاہتی تھی یا کسی شوہر کی آنکھوں میں سلائیاں پھیرنا چاہتی تھی۔ وہ یہ سب نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے تو فوزیہ کے پاس آتی تھی۔
آج پھر ویڈیو ڈے تھا۔ سردی بڑھ چکی تھی۔ راستے میں ایک ریڑھی والا گزر رہا تھا۔ اس کی ریڑھی پر جرابیں، مفلر، ٹوپیاں، رومال اور دستانے پڑے تھے۔ صلہ کی نگاہ کالے رنگ کے دستانوں پر پڑی۔
اس نے دستانوں کی ایک جوڑی پسند کی اور پہن لیے۔
راج نیچے دکان پر تھا۔ وہ اوپر گودام میں تھی۔ اس نے ویڈیو کیمرہ آن کیا۔
"یہ ہے شرح غالب، اس میں آپ کو بہترین تشریحات ملیں گی۔ اب میں اس کے مندرجات آپ کو دکھاؤں گی"
"یہ ہے ایک نادر خطاطی کی کتاب، جی ہاں صادقین صاحب،---"
وہ اس کتاب کے مختلف صفحات پلٹ پلٹ کر تصاویر دکھاتی رہی۔ آج دبی دبی آوازیں نہیں تھیں۔ شاید اس نے دستانے پہن رکھے تھے۔ لیکن یہ صرف چند گھنٹوں کی بات تھی۔
پھر وہی سرگوشیاں اس کی روح کو چیرنے لگیں۔
پھر کوئی دبی ہنسی میں بولا" چلو، اس سے ہاتھوں کی ساخت تو چھپ گئی۔"
اس نے اپنے کانوں کو دوپٹے سے لپیٹ لیا جیسے پردہ تاننے کی کوشش کر رہی ہو۔
کسی کی فرمائش پر الماری کے سب سے اوپر والے خانے میں رکھی ایک کتاب اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ پھسل کر نیچے جا گری، اسی لمحے کوئی چلا کر بولا،
"اتنے بڑے بڑے ہاتھوں سے ایک کتاب نہیں سنبھالی جاتی----"
بس یہ آخری فقرہ تھا جو اس نے سنا---
کئی مدہوش ساعتیں گزر گئیں۔ دو سائے تیزی سے گودام میں داخل ہوئے۔ جیا نے لپک کر صلہ کے بے جان وجود کو اٹھایا۔ ویڈیو چیٹ آن تھی۔
"ارے لوگو، یہ تم نے کیا کیا، ایک محنت کش عورت کو مار ڈالا۔ یہ دیکھو میرے ہاتھ، کتنے نرم نازک ہیں۔ کتنے کومل مگر میں شراب پیتی ہوں، یہ دیکھو، اس نے الماری کے ایک کونے سے شراب کی بوتل پکڑی اور ہونٹوں سے لگالی، میں چرس پیتی ہوں، یہ

دیکھو، اس نے جیب سے چرس نکال کر ایک کتاب پر رکھ دی۔ یہ دیکھو، میں سگریٹ بھی پیتی ہوں۔ اس نے سگریٹ کا کش لگایا۔ صلہ کے ہاتھ برتن صاف کرتے تھے اور کپڑے بھی دھوتے تھے۔ اس کے ہاتھوں نے میرے ہاتھوں کی طرح کبھی شراب کو نہیں پکڑا، کبھی چرس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کی انگلیوں میں کبھی کوئی سگریٹ نہیں پھنسا۔

اس نے ان ہاتھوں سے رزق حلال بھی کمایا۔ کتنے پاکیزہ ہاتھ تھے اس کے۔ تم نے اسے رب کی عطا پر بھی اذیت دی۔ مجھے میری ہی لغزشوں پر نہیں ٹوکا۔

کئی بار، تمہارے سامنے میں نے نشہ اپنے حلق میں اتارا اور تم میری چٹان جیسی چھاتیوں کو دیکھتے رہے۔ تم نے میرے بھرے بھرے کولہوں پر نظر رکھی۔ تم نے میرے نرم و نازک ہاتھوں کو سراہا اور اس کو مار ڈالا جس نے اپنے بدن کو پوشیدہ رکھ کر کتابوں کو تم پر کھولا۔

ہائے، یہ تم نے کیا کیا۔؟

اس نے اپنا چہرہ راج کی طرف موڑا جو مردہ صلہ کے بھولے بھالے چہرے پر خون کی لکیروں کو دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

جیا اٹھی، اس نے راج کا گریبان پکڑ لیا۔ غصے سے اس کی رگیں پھول رہی تھیں۔

"تم نے پہلے جیا کو قتل کیا۔ اب صلہ کو بھی کر دیا۔"

"نہیں جیا، مجھے تو تم دونوں سے محبت ہے۔ تم جانتی ہو۔ میں فیمنسٹ ہوں۔"

جیا نے بوسیدہ کتابوں کی طرف دیکھا جیسے ان سے گواہی مانگ رہی ہو۔ ایک مخصوص بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ شدت درد سے کلبلا اٹھی۔

"ارے کون سی محبت، تم نے مجھے ہوس پرستوں کی بستی میں دھکیل دیا۔ میں جسم بیچتی ہوں اور نشہ خریدتی ہوں۔ تم نے صلہ کو بے رحم گاہکوں کے حوالے کر کے اس کی خیر خبر نہیں لی۔ صلہ کتابیں بیچتی رہی اور روگ پالتی رہی۔ تم فیمنسٹ نہیں، تم ریپسٹ ہو۔"

راج کی قوت گویائی کو صلہ کے تاج کی ڈوریوں نے سلب کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں ملتجی انداز میں صلہ کے سر پر چمکتے ہوئے تاج پر گڑی تھیں اور اس کے کانوں میں جیا کی درد بھری آواز گونج رہی تھی۔

"تمہیں یہ تو پتا ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور کہتا ہے کہ عورت خدا کی صنعت نہیں، بلکہ انسانوں کی بھی ہے۔

تم یہ بھی جانتے ہو کہ محبت انسان کے لیے کتنی ضروری ہے۔

مگر تمہیں یہ پتا نہیں کہ جس سے محبت ہو، اسے شکاریوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتے۔

☆☆☆☆☆

انتظار

رات کے پچھلے پہر کی تاریکی میں جب کرچی کرچی خواب نے آنکھوں کے جھروکے میں اپنے پنجے گاڑ لئے تو اُسے یُوں محسوس ہُوا کہ اُس کے ذہن میں خوف اور حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی کا درد بھی جاگ اُٹھا ہے۔ تاریک رات--- گہری خاموشی --- کچی پکی نیند ---اور خواب آلُودہ فضا--- حیرت زدہ سراسیمگی کا کمبل اوڑھے وہ سوچ کے سمُندر میں غوطہ زن ہو رہا ہے کہ وہ ایسے خواب کیوں دیکھتا ہے۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اگر وہ خواب نہ دیکھے تو اُس کا زندہ رہنا محال ہو جائے گا۔ وہ پریشان ہے کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ قلعہ کی اُنچی فصیلوں پر کرخت چہروں والے پہریدار کھڑے ہیں اور اندر طویل اور مہیب سائے ہاتھوں میں بجھی ہُوئی مشعلیں لئے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے ہیں۔ شاید کوئی آسمان گرنے والا ہے۔ عجیب سا ماحول ہے۔ دھند ہے، اندھیرا ہے، اچانک کسی گھر کے دروازے کھُلتے ہیں پھر کھٹ سے بند ہو جاتے ہیں۔ باہر بے سمت چیخیں بلند ہوتی ہیں۔ پھر فضا میں دم توڑ دیتی ہیں اور پھر اُس اندھیرے میں ایک ہیولا ظاہر ہوتا ہے---ایک عورت کا ہیولا --- بکھرے ہُوئے بال---لیرو لیر لِباس --- تھکن سے چُور بدن اور ویران آنکھیں ---وہ اِنصاف کی دہائی دے رہی ہے۔ ہر دروازہ پر دستک دیتی ہے مگر اُس کی سُننے والا کوئی بھی نہیں ہے اور پھر اُس نے اُس عورت کی فریاد کی رسی کو تھام لیا اور آگے بڑھ کر اُس ہیولے کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے۔ اچانک چاروں طرف سے خوفناک خُونی پرندے اُن پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ وہ ہاتھوں کی تلوار کو لہراتے ہُوئے اُن سے بچنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ وہ زخموں سے نڈھال ہوتا ہے، گرتا ہے، پھر اُٹھتا ہے مگر وہ ہیولا آگے نکل جاتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ اُس کی نظریں چاروں طرف اُس ہیولے کو تلاش کرتی ہیں ---اُف --- کیا مصیبت ہے---وہ واپس گھر کی طرف بھاگتا ہے کہ اُس کی آنکھ کھُل جاتی ہے --- ہر طرف خاموشی ہے---سناٹا ہے---ماتھا پسینے سے

آصف عمران

تر اور پورا جسم کانپ رہا ہے۔ اُس نے چارپائی پر بیٹھ کر ایک سگریٹ سلگایا اور لمبا کش لے کر سوچنے لگا۔ حیرت کی کوکھ سے اُبھرنے والے خواب میں لامکانی، ہجرت اور لاتعلقی کے واضح اشاروں کی اذیت ناک تصویر اُس کے ذہن کی سکرین پر اُبھرتی ہے۔ لمحہ لمحہ خوف --- ہیجان انگیز ماحول --- ہر کسی کا غیر محفوظ جان و مال --- جنت نظیر وادی کے زخم زخم راستوں پر لوگوں کا احتجاج --- گھروں پر چھاپے --- لاپتہ ہوتے نوجوانوں کی شہادتیں --- تار تار ہوتی عزتیں --- ہر طرف قید و بند کی مصیبتیں --- مظلوم لوگوں کی سب کراہیں --- سب آہیں --- سب سسکیاں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ سڑکوں پر فوجی گاڑیوں کی لمبی قطاریں اور اُن میں سوار غاصبوں کی غصے سے بھری شعلے اُگلتی آنکھیں --- یہ سلسلہ اُس وقت سے شروع ہُوا جب راجہ نے ذاتی مفاد کی خاطر قلعے کی چابی اُن ظالموں کے حوالے کر کے رعایہ کی مرضی کے خلاف پُوری وادی پر قبضہ میں مدد دی۔ لوگ احتجاج کرتے رہے۔ اپنے حق کے لئے لڑتے رہے مگر انصاف کے سارے راستے بند کر کے گھر گھر پر پہرے دار بٹھا دیئے اور پھر یُوں ہُوا کہ بڑوں کی منصوبہ بندی سے کنٹرول لائن کی زنجیر نے وادی کو تقسیم کر دیا۔ پہاڑ، دریا، ندی نالے، وادیاں سب تقسیم ہو گئے اور وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کی فریاد پر کوئی بھی کان دھرنے کو تیار نہ ہُوا۔ انصاف کے دروازے بند ہو گئے اور وہ انصاف گھر کی طرف دیکھتا ہی رہا۔ وہاں سب انصاف پسند اکٹھے ہوتے ہیں لیکن انصاف ہوتا نظر نہیں آتا۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتا --- سہارے ڈھونڈتا ہے۔ بحث مباحثے ہوتے ہیں۔ اُمید کے مینار سے روشنی کی کرنیں اُس کے خوابوں کو آباد رکھتی ہیں۔ اُس نے خواب میں دیکھا کہ کچھ لوگ اُس کی وادی کو آزاد کرانے کے لئے جگہ جگہ عقل و خرد کی قندیلیں روشن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حق و انصاف کی خاطر اپنی آوازیں بلند کرتے ہیں لیکن پہرے دار اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرتے گئے اور پھر یہ پہریدار ہر گھر کے سامنے پہنچ گئے۔

سورج کی پہلی کرن کی تیز لہر نے دروازے پر دستک دی تو اُس نے دیکھا کہ دروازے پر ایک کرخت چہرے والا پہریدار کھڑا ہے۔ اُس نے باہر نکلنے کے لئے قدم آگے بڑھایا تو پہریدار نے اُسے باہر جانے سے روک دیا۔ اور کہنے لگا کہ فی الحال اُسے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ باہر کرفیو ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ طاقت کا کیا ہے یہ تو اپنا مدار

بدلتی رہتی ہے۔ آج کرفیو لگ گیا ہے۔ مجھے گھر میں ہی قیدی بنا دیا گیا ہے۔ اُس نے اپنے ذہن میں اُٹھنے والے طوفان کی لہروں کو ضبط کی چادر سے ڈھانپ دیا۔ اور پہریدار سے پوچھتا ہے کہ مجھے کب تک باہر جانے کی اجازت ملے گی؟

اِس سلسلے میں مَیں کچھ نہیں بتا سکتا -- پہریدار جواب دیتا ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ اِس وقت تُم باہر نہیں جا سکتے -- تُم اچھے وقت کے آنے کا اِنتظار کرو۔

دروازہ اَدھ کھلا تھا۔ وہ اَدھ کھلا ہی رہا۔ اُس نے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ پہریدار کو اُس کی یہ حرکت اپنے حکم کی نافرمانی لگی۔ اُس کا چہرہ اَور کرخت ہو جاتا ہے۔ اُس کو دروازے سے دُور دھکیل دیتا ہے۔ یہاں خاموشی سے بیٹھے رہو۔ اور ہاں! اگر تُمہیں باہر نکلنے کا اِتنا ہی شوق ہے۔ پہریدار نے سخت لہجے میں کہا -- تو میری اِجازت کے بغیر باہر نکلنے کی کوشش کر دیکھو۔ لیکن یاد رکھنا کہ مَیں طاقتور ہُوں۔ قانون میرے ساتھ ہے اور مجھے ہر حال میں تمہیں باہر نکلنے سے روکنا ہے۔ ایسی صورت میں تمام تر نتائج کے تُم خُود ذمہ دار ہو گے۔ اُس کو اندازہ ہونے لگا کہ وہ کن مشکلات میں گھِر چکا ہے۔ اب باہر نکلنے کے لئے اُسے حالات کے بہتر ہونے کا اِنتظار کرنا ہوگا۔

کیونکہ اِنتظار کے علاوہ وہ کر ہی کیا سکتا ہے۔ اُس نے پہریدار سے سوال کرنا بھی چھوڑ دیئے کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ اُس کے ہر سوال کا جواب ایک ہی ہوگا کہ تُم باہر نہیں جا سکتے۔ پھر اُس نے پہریدار کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا کہ یہ پہریدار کون ہے۔ اُسے طاقتور کس نے بنایا ہے۔ وہ اپنے جواب کی تلاش میں کہاں کہاں نہیں بھٹکا۔ نا معلوم اور خوابیدہ عدم کو معلوم دُنیا میں کھینچ لایا۔ ساتوں آسمان۔ خُوشبو دار ہواؤں سے مہکی جنت، آگ کے شعلوں میں جلتی ہُوئی جہنم۔ یہاں تک کہ تخلیق کی دیوار کرب کو بھی چھو چکا ہے۔ لیکن باہر خاموشی ہے، مکمل خاموشی -- یہ اِنتظار کا ایک لمحہ ہے جو پھیلتے پھیلتے دنوں، مہینوں اور سالوں کی بساط پر پھیل چکا ہے۔ یہ قیامت کا ایک لمحہ ہے جو چلتے چلتے رُک گیا ہے۔ جس میں وہ وقت اور مقام سے آزاد ہو گیا ہے۔ خواب اور حقیقت -- زندگی اور موت -- ہونے اور نہ ہونے کے درمیان گُم -- وہاں موجود ہے اُس کے گھر سے اِنصاف گھر تک کا فاصلہ طویل اور دُشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ چاروں طرف پھیلی ہُوئی خاموشی سے اُٹھنے والے شور سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آواز کا پرندہ اُس کے گرد اُڑتا رہے اِسی لئے اُس نے سوال کا

ڈول پہریدار کی آنکھوں میں ڈال دیا ہے۔ کیا بعد میں مجھے باہر جانے کی اجازت ہوگی؟

ممکن ہے ایسا ہو جائے--- مگر آج اس لمحہ تمھیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ پہریدار نرم لہجے میں جواب دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے گھریلو سامان کی ایک ایک چیز پہریدار کو رشوت کے طور پر پیش کرتا رہا ہے۔ وہ تمام چیزیں تو قبول کرتا جاتا اور کہہ دیتا تم یہ بھی کر دیکھو--- کوشش کرنے کا حق تو تمھیں حاصل ہے۔ مگر اس عرصہ کے دوران وہ بہت کچھ کھو چکا تھا۔ گھر لٹ چکے تھے۔ رشتے ٹوٹ چکے تھے۔ کئی جانیں قربان ہو چکی تھیں۔ حق کی آواز دبانے کے لئے ظلم کا شور بڑھ چکا تھا۔ باہر سے آنے والے اجنبی آباد ہوتے جا رہے تھے۔ پہریداروں کی تعداد مستقل طور پر بڑھتی جا رہی تھی۔

اُس نے دیکھا کہ اس تمام عرصہ میں صرف اِسی ایک پہریدار کا چہرہ ہی دیکھتا رہا ہے۔ وہ سوچتا اور حیران ہوتا کہ اِس طرف کسی دوسرے پہریدار کا گزر کیوں نہیں ہوتا--- سوچ سوچ کر وہ اِس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ صرف یہی پہریدار اُس کی آزادی کی راہ میں واحد رکاوٹ ہے۔ اگر اُس کو کسی طرح راستے سے ہٹا دیا جائے تو وہ آسانی سے باہر آزاد فضا میں گھوم پھر سکتا ہے۔ وہ اُس کو زخمی کر کے، بے ہوش کر کے یا قتل کر کے آزاد ہو سکتا ہے۔ مگر وہ اِتنا جانتا ہے کہ جسم کے گملے میں اُگے ہوئے زندگی کے مضبوط پودے کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا آسان کام نہیں ہے۔ اُسے یقین ہے کہ کسی بھی آدمی کو مارنا اِنسانیت کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ اِس لئے وہ یہ مشکل کام نہیں کر سکتا۔ وہ اِس خیال کو جھٹک دیتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ تو ایک پُر امن اور محبت کرنے والا اِنسان ہے، وہ ہمیشہ سے ایک بہتر اور خوبصورت دُنیا کے خواب دیکھتا رہا ہے۔ اُسے دُنیا کے ہر اِنسان سے محبت مگر نفرت صرف غاصبوں، جابروں اور اِستحصال کرنے والوں سے ہے۔ وہ تو ہمیشہ سے خلقِ خُدا کی محرومیوں پر آنسو بہاتا رہا ہے۔ وہ خُود ظلم کا شکار ہُوا ہے۔ وہ خُود ظالم کیسے بن سکتا ہے۔ وہ اکثر اپنے بستر پر لیٹا سوچتا رہتا، جمائیاں لیا کرتا اور غصے میں اپنے آپ سے لڑتا رہتا۔ اُسے سوائے کھانے یا کتابیں پڑھنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ اِس عرصے میں اُس نے اُس ایک پہریدار کے علاوہ نہ دُنیا کو دیکھا اور نہ ہی دُنیا والوں کو۔ مگر اُس کی کتابوں کی دُنیا بھی بڑی عجیب دُنیا ہے۔ وہ کتابوں

کے رتھ میں لفظوں کو جوت کر اُس پر سوار ہو کر بڑے اِنہماک اور سرگرمی سے مُلک مُلک کی زبان اور فلسفہ و تاریخ کا مطالعہ کرتا رہا۔ اُن کتابوں کے ذریعے وہ اپنے تخیل میں جنگل جنگل گھوما۔ ہرنیوں اور وحشی جانوروں کا شکار کیا۔ رات کی تنہائیوں میں ہلکے بادلوں کی طرح اُڑ کر خوابوں کی دُنیا میں پہنچ جاتا۔ وہ محسوس کرتا کہ نیلے آسمان پر کوئی لرزتا ہُوا سایہ اُس کی طرف بڑھ رہا ہے جس کے مُنگ پاؤں کی سنہری پازیب ہر بڑھتے قدم پر موسیقی بھری آواز اُس کے دل کے آنگن میں اِس طرح پڑتی جس طرح رحمت ایزدی گنہگاروں پر نازل ہوتی ہے۔ اُس نے اُس موسیقی کی لہروں کو اپنے دل کے آنگن میں رقص کناں دیکھا جہاں اُس کی محبت کے نغمے اُن لہروں کے ہمنوا ہو کر اُسے مسرور کرتے --- سایہ لرزتا رہتا --- پازیب بجتی رہتی --- ستارے داد دیتے رہتے --- وقت کا پہیہ چلتا رہتا --- اُمیدوں کے چراغ جلتے بجھتے رہتے۔ وہ راتوں کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ جاتا اور وہاں سے صُبح کے سورج کو زرد بادلوں میں سے طلوع ہوتے دیکھتا۔ مگر آنکھ کھلتے ہی صرف یہی پہریدار نظر آتا اور وہ سوچنے لگتا کہ اگرچہ آج یہ پہریدار اندھے قانون کی وجہ سے طاقتور ہے لیکن موت ایک دن زمین کے نیچے بسنے والی چوہیا کی طرح اِسے رزقِ خاک کر دے گی۔ غاصبوں کا ظلم، اِستحصال کرنے والوں کی شہرت اور طاقتور پہریداروں کی حشمت سب زمین کے ساتھ جل کر راکھ ہو جائے گی۔ یہ غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ یہ جھوٹ کو سچ، بدصورتی کو خوبصورتی، نا اِنصافی کو اِنصاف سمجھتے ہیں لیکن ایک دن آئے گا جب اِن کی حیرت کی اِنتہا نہ رہے گی اگر یک لخت سیب اور آم کے درختوں پر پھل کی بجائے مینڈک اور چھپکلیاں لگنی شروع ہو جائیں۔ ہرے بھرے باغوں میں گلاب کے پھولوں سے خوشبو کی جگہ گھوڑے کے پسینے کی بُو آنے لگے۔ تب اِن کی کمر اور ہاتھوں کے رگ و ریشے میں پشیمانی اور پچھتاوے کا سیاہ سیال مادہ بہنے لگے گا۔ یہ زمین کے ٹکڑوں پر قبضے کے لئے لڑتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہم بہت کامیاب و کامران ہیں کیونکہ ہم صحیح ہیں۔ نہیں --- بالکل نہیں --- تُم غلط ہو، تُم صحیح ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ دھرتی جنم جنم سے ہماری ہے۔ تُم اِسے چھین نہیں سکتے۔ مَیں اِنصاف گھر پہنچوں گا اور اِنصاف لے کر رہُوں گا --- یہ سوچتے سوچتے وہ اُٹھا اور کُرسی پر بیٹھ کر کچھ لکھنے لگا۔

''اَے پہریدارو!

میں یہ پیغام دُنیا میں بولی جانے والی مختلف

زبانوں میں لکھ رہا ہوں۔ اِسے اُن زبانوں کے ماہرین اور اِنصاف گھر میں بیٹھے ہُوئے لوگوں کو دکھانا - - - اُن کو پڑھانا -- اگر وہ اِسے صحیح سمجھیں گے تو مَیں سوچتا ہُوں کہ وہ میرے لئے آواز بلند کریں گے اور اگر کسی طرف سے ایک بھی آواز حق و سچ کے لئے اُٹھے گی تو مَیں سمجھوں گا کہ میری کوششیں رائیگاں نہیں گئیں - تُم میری اُس روحانی مُسرت کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ مَیں کتنا خُوش ہُوں گا جب تُم سب بہتر اور خوبصورت آزاد زندگی گزارو گے۔ کل سورج کی پہلی کرن کا ہاتھ تھام کر مَیں اِنصاف گھر میں پہنچ جاؤں گا۔ مگر تُم ایک بات یاد رکھو کہ ہر شخص اِنصاف اور آزاد فضا تک رسائی چاہتا ہے۔ اِنسانی ذہن میں صدیوں سے پیدا ہونے والے خیالات اور تاریخی واقعات میرے دماغ کی وسعت میں سما چکے ہیں۔ اور مَیں اِس نتیجہ پر پہنچا ہُوں کہ ہر چیز باطل ہے، ناپائیدار ہے، ایک پُشت آتی ہے اور پچھلی پُشت چلی جاتی ہے مگر وقت کا پہیہ چلتا رہتا ہے۔ اِس کو کوئی نہیں روک سکتا۔ میری اِنتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں"۔

پہریدار حیران ہو کر اکثر سوچتا ہے کہ یہ شخص اِن حالات اور ماحول میں اب تک مر کیوں نہیں گیا۔ اِس کا جذبۂ شوقِ شہادت نہ جانے اب تک اور کیسے زندہ ہے۔ آہ بے چارہ، باہر جانے کی خواہش میں وقت کی صلیب پر سُوکھ کر اِس کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ پہریدار نے کمرے کی طرف دیکھا وہاں ایک شمع ٹمٹما رہی ہے اور وہ میز کے سامنے بیٹھا ہے۔ وہاں سے پہریدار کو صرف اُس کی پیٹھ، سر کے لمبے بال اور ایک ہاتھ دکھائی دے رہا ہے۔ کھلی ہُوئی کتابیں میز پر، کرسیوں پر، اور فرش پر بکھری پڑی ہیں۔ اُس کے پڑھنے کی مثال یُوں لگتی ہے جیسے وہ سمندر میں تباہ شدہ جہاز کے ٹُوٹے ہُوئے تختوں کے درمیان تیر رہا ہے اور اپنی جان بچانے کی جدوجہد میں ایک تختے کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف پھر دوسرے کو چھوڑ کر تیسرے تختے کی طرف نہایت بے تابی سے لپک رہا ہے۔ رات کے پچھلے پہر میں نیند سے بوجھل دماغ کو ہلکا کرنے کی خاطر پہریدار نے سوچا کہ وہ اُس کے قریب جا کر اُسے دیکھے اور اُس سے بات کر کے پوچھے آخر وہ یہ قید تنہائی کس کے لئے کاٹ رہا ہے۔ پہریدار کمرے میں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ میز کے سامنے ایک عجیب و غریب اِنسان بیٹھا ہُوا ہے۔ اُس کا حلیہ بدل چکا ہے۔ جسم سُوکھ کر ہڈیوں کا پنجر بن گیا ہے۔ بال عورتوں کی طرح لمبے اور داڑھی بڑھ چکی ہے۔ چہرہ زرد اور مٹیالا ہو چکا ہے۔ سفید

بالوں والے سر اور جھریوں والے چہرے کو دیکھ کر اُسے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی صحت مند اور خوبصورت نوجوان ہے جو اُسے پہلے دن ملا تھا۔ جھکے ہوئے چہرے کے سامنے میز پر ایک کاغذ پڑا ہوا تھا، جس پر باریک حرفوں سے کئی زبانوں میں ایک پیغام لکھا ہوا تھا۔ پہریدار نے کاغذ اُٹھایا اور اُسے پڑھنے لگا۔

پہریدار کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ چکا تو اُس کے ذہن میں ہمدردی کی لہر کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے خیالوں اور سوچوں کی دیواریں لرز اُٹھیں۔ اُس کو اِس حال میں دیکھ کر پہریدار نے اِس سے پہلے کبھی اپنے آپ کو ایسا حقیر نہ سمجھا تھا جیسا وہ اب خود کو محسوس کر رہا تھا۔ اُسے اپنا ہر عمل ندامت کے تیروں کی طرح خود میں پیوست ہوتا محسوس ہوا۔ اُسے اپنی زندگی ظلم اور زیادتی کی علامت بن کر ماتھے پر پسینے کے قطروں کی طرح محسوس ہوئی۔ اُن تمام برسوں میں گزرے وقت کے واقعات ایک سوال بن کر اُس کے وجود کے سمندر میں تیرنے لگے۔

پہریدار نے دیکھا کہ ناتوانی کے سبب وہ اپنا جسم اُٹھانے سے بھی معذور ہو چکا ہے۔ اُس کے سب سوال ختم ہو چکے ہیں اور اب یہ شخص اپنے اختتام کے قریب پہنچ رہا ہے مگر اُس کی کمزور آنکھوں میں اُمید کی شمع روشن ہے۔ جس کی روشنی سے کمرے کی سب دیواریں روشن مینار بن چکی ہیں۔ پہریدار نے محسوس کیا کہ اُس کی ہڈیوں کے ڈھانچے میں آہستہ آہستہ حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ تب اُس حرکت نے آنکھوں میں جلتی ہوئی اُمید کی شمع کی جلتی ہوئی رسی کو پہریدار کی سماعت کی جھاڑی پر پھینک دیا جس سے اُس کے کان جل اُٹھے اور آنکھوں کے سامنے ایک لرزتا ہوا سایہ فضا میں حرکت کرنے لگا جس کے سُبک پاؤں کی سنہری پازیب ہر بڑھتے قدم پر موسیقی کی لہریں پیدا کر رہی ہے۔ سایہ لرزتا رہا--- پازیب بجتی رہی--- شب گزیدہ سحر بکھرتی رہی۔ پہریدار خاموشی سے اُس کی خاموش آواز کو محسوس کرتا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ ہڈیوں کے ڈھانچے میں حرکت پیدا ہوئی۔ سائے نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اُسے اُٹھا کر دروازہ کی طرف چلنے لگا اور پھر باہر نکل کر گلی میں آگے بڑھنے لگا۔ پہریدار کی نظریں خاموشی سے اُس کا تعاقب کرتی رہیں، گلی کے موڑ تک وہ نظر آتا رہا پھر موڑ مڑتے ہی پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ تب پہریدار نے چاروں طرف بکھری کتابوں اور خالی کرسی کو دیکھا، اُس کا لکھا ہوا پیغام جیب میں رکھا اور خود بھی دروازہ کھلا چھوڑ کر گلی کے موڑ پر غائب ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

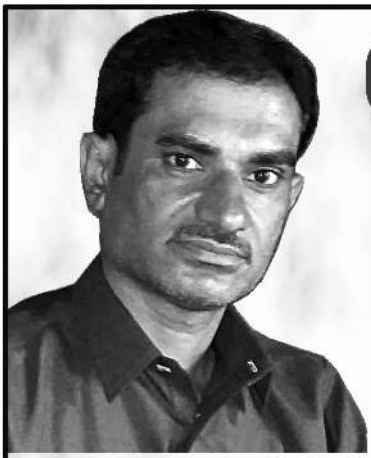

جمالیاتی منہاج کا شاعر

شاعرِ امروز
ممتاز گورمانی

شاہد ماکلی

ممتاز گورمانی کے شعری سفر کا دورانیہ مختصر سہی مگر ان کے ہاں اچھے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے- یہ امر بہ جائے خود استعجاب انگیز ہے کہ انھوں نے تاخیر سے شعر گوئی آغاز کی اور تخلیقی بلوغت کی ارفع سطوح تک باریاب ہو کر اتنے کم عرصے میں اپنی تازہ و توانا آواز کے بل بوتے پر شناخت قائم کی- شاید اس کی سب سے پہلی اور بڑی وجہ تو ممتاز گورمانی کا وہ فطری تخلیقی جوہر ہے جو رب سخن کی بارگاہ سے انھیں بطور خاص ودیعت ہوا ہے- پھر اس جوہر کی آبداری کے پیچھے ان کے سینے کا صدق ہے___ طبع میں پائی جانے والی درویشی، بے نیازی اور انکساری کا خمیر ہے جس کی خوشبو دار زرخیزی ان کی تخیلی پرواز کو شعری رفعت سے ہم کنار کرتی ہے اور ان کے تخلیقی ابعاد کو افق بہ افق وسعت پذیر رکھتی ہے-

کسی بھی تخلیق کار کی کامل شعری تفہیم اس کی زندگی، ذات اور زمانی مکانی پہلوؤں کے سنجیدہ مطالعاتی تفہیم کی متقاضی ہوتی ہے- ممتاز گورمانی میرے بہترین ادبی دوستوں میں سے ایک ہیں- ان سے ہر بار مل کر ایک سرشاری کا احساس ہوا ہے- ان کی گفتگو اور ان کا دوستانہ سماجی رویہ ہر طرح کے تصنع سے بالاتر ہے- زندہ دلی، شگفتگی اور سادگی و اخلاص میں لپٹا ہوا ان کا طرز احساس اور طرز زندگی حوصلہ افزا ہی نہیں قابل رشک بھی ہے-

شعر گوئی کے اوائل سے ہی ممتاز گورمانی مجلس آرائی کی کثرت اور مشاعراتی گروہ بند کارفرمائی سے گریز پا ہیں- ایک دور افتادہ گاؤں میں بیٹھے اپنے خون جگر سے نخل سخن کی آبیاری میں مگن ہیں اور جمالیاتی معنوی تکثیریت کے گلہائے رنگ رنگ کی نمو پذیری میں محو ہیں-

تونسہ کے ایک گاؤں سے ان کا تعلق ہے-

1975 میں پیدا ہوئے - زمیندار گھرانے سے ہیں- 2010 کے لگ بھگ شعر کہنا شروع کیا - پہلا شعری مجموعہ ترتیب و تدوین کے مراحل میں ہے-
مختصر سا شعری انتخاب آپ کی ضیافت طبع کی نذر:

راستہ بھولنے کا مطلب ہے
ہم کبھی راستے پہ تھے شاید

یہ آنکھ مفت میں کچھ بھی نہیں دکھاتی مجھے
میں اس کو خواب دکھاتا ہوں اور دیکھتا ہوں

گر پڑا ہوں تو راستے نے کہا
تیرا مجھ پر تو دھیان تھا ہی نہیں

کشش زمیں میں زیادہ ہے آسمان میں کم
ہوا میں خاک اڑاتا ہوں اور دیکھتا ہوں

نیند کی ذرہ نوازی ہے کہ لے جاتی ہے
خواب تک کوئی اکیلا تو نہیں جا سکتا

اتنی اونچی ہے کہ اب بیل کا دم گھٹتا ہے
جانے دیوار سے کیا گھر کے مکیں چاہتے ہیں

وہ ملے گا تو شناسائی دلوں تک ہو گی
اجنبیت تو فقط سامنے آنے تک ہے

پتے گرے تو جسم چھپانے کے واسطے
پیڑوں نے اپنا آپ پرندوں سے بھر لیا

تم کہانی کے مرکزی کردار
ہم کہیں حاشیے پہ تھے شاید

دو زمیں زاد جس میں رہ سکتے
اس قدر آسمان تھا ہی نہیں

اس نظر نے تو ہر طرف دیکھا
ہم غلط زاویے پہ تھے شاید

ہم نے پھولوں سے خوب باتیں کیں
باغ میں باغبان تھا ہی نہیں

کبھی میں پوچھتا رہتا تھا، کون ہے در پر؟
اور اب میں دوڑ کے جاتا ہوں، اور دیکھتا ہوں

صلح اس بات پہ کر لیں تو خرابی کیا ہے
دونوں ہمسائے ہیں اور اردو زباں بولتے ہیں

جو شخص پیار کا منکر ہے، سامنے آئے
میں اس سے آنکھ ملاتا ہوں اور دیکھتا ہوں

لفظ چنتے ہوئے اعصاب بھی تھک جاتے ہیں
جھوٹ آسانی سے بولا تو نہیں جا سکتا

کوئی خوشبو ہے جو ہمراہ چلی آتی ہے
آدمی باغ سے تنہا تو نہیں جا سکتا

☆☆☆☆☆

ارتقائی منہاج کا کمسِن شاعر

شاعرِ امروز

وریداللہ وریدؔ

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں عمدہ غزل کہنے والے کئی تازہ کار نوجوان شاعر سامنے آئے ہیں۔ خوشاب سے تعلق رکھنے والے وریداللہ وریدؔ ان میں سے ایک ہیں جنھوں نے مختصر شعری عرصے میں اپنی توانا غزل گوئی کی بنا پر توجّہ حاصل کی ہے۔

وہ گیارہ نومبر 2001 کو نور پور تھل قصبہ ٹاہلہ میں پیدا ہوئے 2018 سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ بی اے کے طالب علم ہیں۔ اتنی کم عمری میں ان کی فنی پختہ کاری اور معنوی تازگی حیران کن ہے۔ ان کی غزل اسلوبیاتی و معنوی ہر دو سطح پر ارتقا پذیری کی طرف رواں دواں ہے۔ ذیل میں ان کے کچھ منتخب اشعار:

یہاں پرندے نئے گھونسلے بناتے ہیں
یہ سرزمین محبت کی سرزمیں ہو گی

تمام عمر پڑاو پہ انحصار کیا
ہماری آخری منزل کہیں نہیں ہو گی

میں خاک و نور کے پیوند سے بنایا گیا
یہ اشتراک ضروری تھا جسم و جاں کے لیے

شاہد ماکلی

سنا ہے آپ کا ذوق نظر کشادہ ہے
بتائیں آپ کو کیسا دکھائی دیتا ہوں

آؤ دیکھیں کس طرح کا روپ دھارے گا افق
آؤ صورت دیکھ آئیں آسمانی شام کی

ایک لا شکل عکس دیکھا تو
آئنہ اپنا آپ بھول گیا

رات اکتا چکی اندھیروں سے
اور دیا روشنی سے بوجھل ہے

کوئی آواز دینے والا نہیں
اور مڑ کر بھی دیکھنا ہے مجھے

تجھ سے آگے میں دیکھتا ہی نہیں
میرا ایمان کتنا کامل ہے

یہ دل میں آپ جو کچھ کہہ رہے تھے
مجھے سب کچھ سنائی دے رہا تھا

تیتر کی بولیاں تھیں درختوں کے اُس طرف
اور دوستوں کی بھیڑ میں اُلجھا ہوا تھا میں

☆☆☆☆☆

منظر کیسے بدل سکے!

ہمارے اِرد گرد اور قدم قدم پہ نت نئے، سوال ہی سوال ہیں
کہ جن کا شجرۂ نسب ہے دُور تک رواں دواں
اُس ایک پَل کی موج میں
کہ جس میں ایک جا ہوئیں زماں مکاں کی وسعتیں
اور اُس کے بعد چل پڑا
یہ اجنبی سا سلسلہ، سوال اور خیال کا
فروغ زخم جستجو اور اس کے اندمال کا
گئی رُتوں کی کھڑکیوں سے جھانکتے ملال کا

ابھی کسی سوال کا جواب ڈھونڈنے پہ ہم
نہ لے سکے تھے اک سکوں کا سانس بھی
کہ اَن گنت سوال اس جواب سے نکل پڑے
تھکن ابھی مٹی نہ تھی کہ پھر سے لوگ چل پڑے

امجد اسلام امجد

سفر میں ہر مقام پر نظر نظر سوال ہے
جو ابتدا میں تھا وہی پھر آج دل کا حال ہے
طرح طرح کے وسوسوں میں خواہشوں کے سائے ہیں
کہ واہموں نے جن کے گرد مورچے لگائے ہیں

اور اس عجب سے کھیل ہی
کے درمیاں ہے زندگی
نصاب جس کا طے نہیں
وہ امتحاں ہے زندگی

اُمّتِ مُسلم کو درپیش مسائل

اُس طرف دُشمن تلے ہم سب کی بربادی پہ ہیں
عہدِ حاضر کی زوال آمادگی کا ہر علاج

ایک اِس نقطے پہ ہے ان سب میں کیسا اِتفاق!
ہے کہیں تو ہے فقط وُہ اُمّتِ مُسلم کے پاس

اُمّتِ مُسلم کی حالت اِس طرف مت پوچھیے
دے نہیں سکتے ہمیں دُشمن کسی صورت شکست

بڑھتا ہی جاتا ہے اِن کا انتشار و افتراق
شرط بس اتنی سی ہے، بھولیں نہ ہم اپنی اساس!

اور بزعمِ خود سُپر پاور کے تیور بھی ہیں خوب
قُوّتِ باطل کے جو بھی نقش ہیں مٹ جائیں گے

ایسا طاقت کا نشہ ہے جو اُترتا ہی نہیں
ہم اگر پوری طرح مذہب کا دامن تھام لیں

آخری منظر مگر بنتا ہے کیا، یہ دیکھیے
جو مصیبت کی گھڑی بھی آئے گی ٹل جائے گی

وقت کا مُنصِف رعایت کوئی کرتا ہی نہیں
ہر گھڑی اللہ اور اس کے نبی کا نام لیں

ایٹمی ہتھیار ہیں کیا شے خدا کے سامنے!
یہ بکھر سکتے ہیں پل میں مثلِ تارِ عنکبوت

اختیارِ کُل کسے حاصل ہے رُوئے ارض پر
یہ سونامی اور کترینہ سے ملتا ہے ثبوت

جانے کیوں مرعوب مغرب کی چمک سے ہم ہوئے
مغربی تہذیب خود احساسِ ناکامی میں ہے

جتنے اِس اُمّت کو ہیں درپیش امراضِ کہن
اُن کا درماں صرف تعلیماتِ اسلامی میں ہے

نسیمِ سحر

مرے بھائی [ایک خبر سے متاثر ہو کر]

مرے بھائی!
..... تجھ کو آنا تھا
تجھے دیر ہوئی
میں ماری گئی
تو آجاتا میں جی لیتی
اِس گھر میں جو تیرے نام پہ تھا
مجھے گھر در کی کوئی طلب نہ تھی
لیکن میں جینا چاہتی تھی
مجھ سے پہلے تُو آجاتا
میں جی لیتی اپنا جیون
مرے جھولے میں پڑے تکیے پر
جو خواب ابھی تک سوگ میں ہیں
انہیں سجنا تھا ، انہیں کھلنا تھا
مری نئی نکوری آنکھوں میں
لیکن وہ لہو میں ڈوب گئے
مرے بھائی تُو جلدی آجاتا
ترے ساتھ میں کچھ دن جی لیتی
نفرت کا پیالہ پی لیتی
مرے بھائی-- میرے بابا نے
تری خواہش دل میں پالی تھی
میں بن مانگی ، بن چاہی تھی
میں لڑکی تھی ، میں دوشی تھی
سو جھولے میں مرا خون بہا
بابا سے میں نے کچھ نہ کہا
لیکن تجھ سے ہے ایک گلہ
کیوں دیر لگائی آنے میں
مرے بھائی-- تجھ کو دیر ہوئی
تُو آجاتا میں بچ جاتی---

حمیرا راحت

وگرنہ دشمن ایماں کا رقص جاری ہے

صدائے حق کیلئے بھی نکل نہیں سکتے
نظر میں اُن کی ہے توقیر کب اداروں کی

نہیں ہے غیرتِ ایماں یہ سوچتے کب ہیں
کہاں وہ سوچتے ہیں ہیر بے نظیروں کو

یہی ہیں سوچتے اس دیس نے دیا کیا ہے
شبِ سیاہ میں جگنو بدن بھی ہیں گھائل

کبھی تو دیکھ لیں آؤ ذرا گریباں بھی
اے میری قوم کے زندہ ضمیر پروانو!

کہ ہم نے دیس کو آخر بھلا دیا کیا ہے
نظامِ وقت میں جینا بھی ہو گیا مشکل

جو کر رہے ہیں سیاست اسیر لاشوں پر
ابھی بھی وقت ہے سوچو وطن کی آزادی

میں سوچتا ہوں، یہ توہینِ آدمیت ہے
وگرنہ دشمن ایماں کا رقص جاری ہے

لہولہو ہے مرے دیس کا ہر اک مومن
مرے وطن کا وہ کہتے ہیں جو کہ شہ رگ ہے

لگی ہے آگ وہاں بھی لہولہو ہے وہ
خودی میں مست ہیں بدبخت بے غرض ہم سے

انا کے عرش پہ بیٹھے ہیں وہ منافق جو
غرض کی بھوک میں بکتے ہیں دام لیتے ہیں

یزیدِ وقت کے جو مغربی حواری ہیں
وہ اپنی قوم کی تعظیم سوچتے کب ہیں

رکھا ہے سر پہ عمامہ کہے وہ زاہد ہوں
کہاں وہ سوچتے ہیں دیس کی امامت کو

جو اپنی ذات کی شاہی میں ہو چکے اندھے

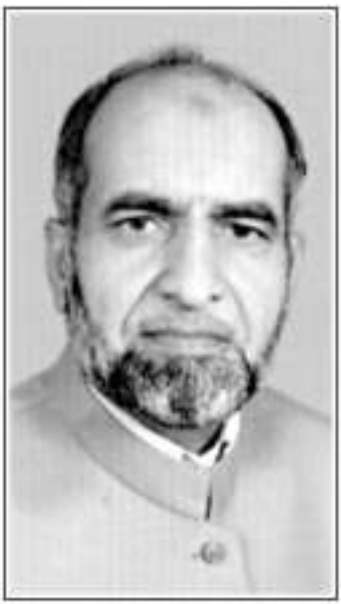

گل بخشالوی

بار

بار کے سامنے
دوست ہنستے ہیں جب تیز گاڑی کے پہیے، سڑک کی رگڑ سے پگھلتے ہیں
جلنے کی بو اور چنگھاڑتی تیز رفتار گاڑی اچانک قریب آ کے جھٹکے سے رکتی ہے
پہیوں کی چیخوں میں لپٹی ہوئی گالیوں کی صدائیں ابھرتی ہیں
اور آنے والے کہانی سناتے ہیں
''فٹ پاتھ نے آج روکا، وگرنہ یہ گاڑی کہیں نہر میں جا نہاتی
مگر کیا کریں،
زندگی، سالی یہ تو تبھی لطف دیتی ہے جب گاڑی اڑنے لگے
ورنہ کیا زندگی!''

بار کی میز پر
چند اوندھے پڑے، چند سیدھے رکھے
کانچ کے جگمگاتے گلاسوں میں رنگوں کی جھلمل ہے
اِس جھلملاہٹ میں رقصاں بدن، لڑکھڑاتے ہوئے دائرے اور لکیریں بناتے ہیں
بے فکر لمحوں میں بے سمت باتیں ہیں
روشن جبینیں، شرابور آنکھیں ہیں
ہاتھوں میں انگارے جلتے ہیں
سانسیں دھوئیں میں پگھلتی ہیں
اور چٹکیوں سے شرارے نکلتے ہیں
ہر شے سے یوں بے خبر ہیں
کہ جیسے یہ دُنیا اُلٹ بھی گئی تو پے رقص بجتی ہوئی دُھن رُکے گی نہیں

بار کے قمقمے

نیند اور خواب کے درمیاں آ گئے

چند بلوریں یادیں اور ان کو بھلاتے ہوئے دل، لپکتے ہوئے ہاتھ

بھولے ہوئے ہیں کہ یہ رات کا کون سا پہر ہے

پھر اسی موج میں، اپنی گاڑی کی چابی کا چھلا گھماتے ہیں اور ڈگمگاتے ہوئے گاڑیوں تک پہنچتے ہیں

پہیوں کے جلنے کی بو اور چنگھاڑتی تیز رفتار گاڑی کی آواز آتی ہے

فٹ پاتھ پر نیم خوابیدہ بوڑھے فقیروں کے خوابوں کی گٹھڑی میں نوٹوں کی گنتی مکمل نہیں ہونے پاتی

یہ آسودگی میں مگن نوجواں، بے خبر نوجواں

اپنی مستی میں بھولے ہوئے ہیں کہ انگلی میں منت کے چھلے،

گلے اور بازو میں تعویذ ہیں

اور کلائی میں گرہیں لگے کالے دھاگے ہیں

اشکوں سے گوندھے، دعاؤں سے باندھے ہوئے!

عنبرین صلاح الدین

عورت

خدا نہیں ہے وہ لیکن خدا کی صورت ہے
جو عام لوگ سمجھتے ہیں بس کہ مورت ہے
کسی کی ماں ہے بہن ہے کسی کی بیٹی ہے
جو کم شناس ہیں ان کی فقط ضرورت ہے

جو اپنی ذات میں سب سے جدا ہے عورت ہے
وہی وہی جو سراپا وفا ہے عورت ہے
کہو تو ایک حقیقت یہاں بتا دوں میں
وہ جس کو رتبۂ خالق ملا ہے عورت ہے

وہ ماں کے قدموں میں جنت کی بات اپنی جگہ
سلوک ہوتا ہے جو ماں کے ساتھ اپنی جگہ
وہ جن کی آدھی وراثت بھی پوری آدھی نہیں
وہ بیٹیوں سے جو ہوتا ہے ہاتھ اپنی جگہ

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ تو کہہ، کیا ہوا، اے ہوائے اَلم
دور تک تار سا بادباں بھی نہیں

ابہام کے ریشے

کاٹتے ہیں
کتے
زخم سرخ مرچوں کی تلاش میں
بھٹکتے ہوئے
کسی نیم خواندہ جملے کی سرگوشی میں
درختوں کی خاموشی کو
مرہم کا تعویذ پہنا کر
ہواؤں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں

کاٹتے ہیں
خوابوں کے تیور
گم شدہ یادوں کے اوراق
ہونٹوں سے بے ربط آوازوں کے ہجوم
نارسائی کی ضیافت میں
چیخوں کے انبار لگا دیتے ہیں

کاٹتے ہیں
مسافرت کے رت جگے
گرد آلود زمانوں کے عکس
دعاؤں کے رنگین تھان
جو میرے بدن سے لپٹ کر
نجانے کہاں روپوش ہو جاتے ہیں

کاٹتے ہیں
جہالت کی کھوکھ سے نکلے سانپ
ہمیشہ ٹیڑھے میڑھے چلتے ہوئے
کمزور لمحے کی ٹوہ میں رہتے ہیں

کاٹتے ہیں
لفظ اور لہجے
جن کا تریاق ڈھونڈتے ڈھونڈتے
خاک کی ابدی نیند کا توازن
بگڑ جاتا ہے

امجد بابر

نثری نظم

میں اب سو جانا چاہتی ہوں
گہری نیند
موت کی آغوش میں
جہاں اشانت وادیاں ہیں
ملنے اور بچھڑنے کے ڈر سے پرے
وسیع اور مہیب تاریکی کے جنگل میں جہاں سناٹے بولتے ہیں
اور تنہائیاں شب دیجور سے تکلم کرتی ہیں
جب برسوں بعد کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے تو
تنہائی کھلکھلا اٹھتی ہے
شہر خموشاں میں میلا سا لگ جاتا ہے
جب آنکھیں مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں تو انتظار بھی آنکھوں کے دریچوں سے
رخصت ہو جاتا ہے
"برسوں بعد مردہ دل پر یاد کی دستک لافانی خوشی ہے"

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا کہوں شہرِ غزالاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا
جانِ جاں! میں نے یہ زنداں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

تیسری دنیا

نہ جانے کتنے سالوں سے
نہ جانے کتنی صدیوں سے
یہاں کچھ بھی نہیں بدلا
یہاں پر زندگی کیا ہے۔۔۔اذیت ہی اذیت ہے
خموشی چیختی ہے اور خوشیاں بین کرتی ہیں
یہاں کی کھیتیوں سے بارشیں ناراض ہیں
فصلوں پہ میٹھا پھل نہیں آتا
یہاں کے ڈیم خالی ہیں
ہماری صبحِ صادق بھی کوئی شامِ غریباں ہے
یہاں سورج اجالا ڈھونڈتا ہے
رات ڈرتی ہے اندھیرے سے
عجب اِک حسرتِ تعمیر ہم میں گنگناتی ہے
ہم آنکھیں کھول کر دیکھیں
تو پھر بھی اَن کھلی ہی ہیں
نظر کے سامنے منظر ہیں جو رنگوں سے خالی ہیں
یہاں ہر روز ہی اِک مسئلہ ہے،
الجھنیں ہی الجھنیں ہیں
وقت کی بے ربط گردش ہے
خلش یہ ہے کہ سیدھا چلتے رہنے سے
کبھی منزل نہیں ملتی
یہاں دیوار در دیوار ہے رستہ نہیں ملتا
یہاں رستہ بنانے کی تگ و دو کرنے والوں کو
سیاسی بھینٹ چڑھنا ہے
کوئی امید کی شمعیں جلاتا ہے
تو اس دھرتی کے کتے بھونکتے ہیں کاٹ کھانے کو
یہاں پاکیزگی اوڑھے فرشتے بھی اُتر آئیں
تو وہ مدِمقابل سے اُلجھ جائیں
یہاں پر موت بھی چاہیں تو وہ قسطوں میں ملتی ہے
ہماری سرحدوں پر گھن گرج بارود گولوں کی
سنہری چاندنی راتیں ہوں یا سورج کی حدت ہو
ہماری تیسری دنیا کے موسم ایک جیسے ہیں
یہاں اعلیٰ دماغوں کی پنیری پھوٹتی ہے
جو ترقی یافتہ ملکوں میں جا کر اپنے ہی
ماضی کو یکسر بھول جاتی ہے
یہاں پر عالمی سازش کے اتنے جال ہیں جن سے
نکل جانا کوئی آسان تھوڑی ہے
ہماری اکثریت صرف لالی پاپ پر خوش ہے
انہی میں ایک میں بھی ہوں
انہی میں ایک تم بھی ہو

زعیم رشید

نظم

دیوار گراتا ہے دیوار اٹھاتا ہے
بنتی تو نہیں لیکن کچھ بات بناتا ہے

جو بات بھی کرنی ہے جی بھر کے ابھی کر لو
پنچھی اگر اڑ جائے کب لوٹ کے آتا ہے

جو چاک گھماتا ہے جو نقش بناتا ہے
ہم کس کو کہیں اپنا ہم کس کی کریں پوجا

جو خواب دکھاتا ہے وہ خواب چراتا ہے
آباد حویلی میں اب خاک ہی اڑتی ہے

جو قد میں نمایاں تھا وہ ٹھوکریں کھاتا ہے

شکور احسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تجھ سے تو اٹھ سکے گا نہ یہ بارِ دوستی
مجھ پہ نہ آ پڑے کہیں دیوارِ دوستی

تشنگی

ایک دن تشنگی سے وہ مر جائے گا

جس کو نارِ محبت ہے گھیرے ہوئے
جس کی قسمت میں دشتِ فراق آ گیا
جس کا اسباب رستے میں لوٹا گیا

جس کی راہوں میں کوئی بھی سایہ نہیں
جس نے کچھ بھی زمانے میں پایا نہیں

جس نے دریائے وصلت کو دیکھا نہیں
جس کی ساحل سے کچھ آشنائی نہیں
جس کی گٹھڑی میں چاہت کا پانی نہیں

ایک دن وہ حدوں سے گزر جائے گا
ایک دن تشنگی سے وہ مر جائے گا!

زین علی رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چشمِ نم جن پہ تھے اہلِ دل، اہلِ غم
آج ان بستیوں کے نشاں بھی نہیں

اپریل فول 2022

قدیمی حویلی کی ویران چھت پر بھٹکتی اُداسی
گلی سے گزرتے ہمکتے ہوئے نونہالوں کی
انگلی پہ رکھا ہوا
ایک آنسو اُچھالے
قدیمی حویلی اُسے تھپکیاں دے
تسلی کے سکے اُچھالے پلٹ کر گلے سے لگالے

قدیمی حویلی
اُسے ایک قصہ سنائے کہ دیکھ اے اُداسی
یہی بام در تھے،
یہی کھڑکیاں تھیں
یہی ریشمی پردہ سازی تھی اور آنکھوں میں بچھی
چارپائی کا میلہ بھی جوبن پہ تھا
رنگ تھے، روشنی سے بھری تشتری پھر رہی تھی
یہی کمرے تھے جن کی بوجھل فضا میں
سدا قہقہوں کی بہاریں رواں تھیں
کسی لمس کی لذتوں کی مہک تھی
گلی سے گزرتے ہوئے نونہالوں کو
مجبور کرتی تھیں
وہ بھی مہک کی طرف چل پڑیں
اے اُداسی! تو تنہا نہیں ہے
ترے ساتھ ویران بوڑھی حویلی بھی
نوحہ کناں ہے

اُداسی! تو تنہا نہیں ہے
ترے ساتھ نوخیز تنہائی بھی رو رہی ہے
اُداسی! یہ ویران منظر جسے پہلے منظر سے جوڑوں تو اک
فاصلہ روبرو ہے
اُداسی یہی فاصلہ میرا ماضی، مرا حال ہے
اک زمانہ جو اوجھل ہے
ہر آنکھ سے
جسکی تدفین میں سارے حاضر ہوئے
کتنا کچھ میری دیوار پر
جھوٹ سچ ایک لائن میں لکھا گیا ہے
مگر میں یونہی اک عمارت کی صورت
ہر اک آتے جاتے کو حسرت سے تکتی رہی ہوں
اُداسی! میں بوڑھی قدیمی حویلی نہیں
وقت ہوں.....
اور مشکل میں ہوں

اعجاز رضوی

خطوط

آصف ثاقب

جیتے جو گے از حد پیارے عمران منظور صاحب

السلام علیکم!

بوئی کے عطر بیز رنگ آمیز ماحول میں 'بیاض' کی شاعری اور نثر دل کو لبھاتی ہے۔ یہاں دریک اور کیکر کے پھول کھلکھلا رہے ہیں۔ 'بیاض' کا حسن ادب سونے پر سہاگہ ہے۔ افسوس یہ ہے کہ پاکستان کی سیاست ہمارے سیاست دانوں کی بھینٹ چڑھی ہوئی ہے۔ خود غرضی اور مفاد پرستی ذاتی چیز ہوتی ہے مگر اسے قوم اور عوام سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ ان سے کوئی پوچھے میاں آپ نے قوم اور عوام کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں نہیں کچھ کیا تو اب کیا کریں گے۔ اقتدار بچانے اور اقتدار حاصل کرنے کی خاطر بقولے سر پر کفن باندھ لیا ہے عوام اور قوم کو آپ اپنے مقاصد کی تکمیل کو سڑکوں پہ لے آتے ہیں اقتدار بچانا ہوتا ہے لوٹ مار چھپانی ہوتی ہے۔ پاکستان کو آپ نے "کچ کا کھلونا" بنا رکھا ہے۔ خدا اس غریب ملک کا حافظ ہو۔

رمضان شریف کا استقبالیہ بیاض بہت پسند آیا۔ 'بیاض' جب آتا ہے آنکھوں کے راستے دل میں اُتر جاتا ہے "آپ بیتی" میں اب کے مختلف استقبالیہ صورت حال ہے۔ شوکت علی شاہ مضمون میں حیرت، حسرت اور رغبت کے سامان مہیا کر دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں تو اپنی بے ساختگی کو جریدہ جریدہ کر دیتے ہیں۔ 'بیاض' میں میرے خط کو بڑی عزت ملتی ہے۔ مجھ سے اپ جو خاص نسبت رکھتے ہیں۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کپوزنگ کے مسائل بریں ہم موجود ہیں۔ امیر السلام شرقی (ش ر ق ی) کو مشرقی بنا دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی کتاب "تحقیق کی روشنی میں" ہے۔ نسیم سحر آفتاب احمد ملک، فیض رسول فیضان، طالب انصاری، حکیم خان حکیم نے میری ہمت افزائی کی ہے۔ بہت مہربانی خطوط کا حصہ "نقد و نظر" کا آئینہ بند ہے۔ اس سے سوچ کی کئی راہیں کھلتی ہیں۔ حمد و نعت، عقیدت، محبت بھرا کلام ہے۔ شاعر آنسو آنسو کہتے ہیں اور کلام آنسو آنسو پڑھا جاتا ہے۔ مرزا آصف رسول عقیدت میں بے مثال ہیں۔ وہ جس طرح دل کی بات کرتے ہیں اس طرح بہت کم کی جاتی ہے۔ پروفیسر ہارون الرشید کی نعت کی امیجری حسن اختصاص رکھتی ہے۔ سبھی عقیدت نگاری اپنی اپنی جگہ احترام و محبت کی عکاسی کرتی ہے۔ سب اہل عقیدت کو میں صدق و دل سے یاد کرتا ہوں اس مبارک مہینے میں ان کا کلام "سدا بہار" ہے۔ اللہ اور توفیق دے۔ احمد حسین مجاہد بھی ہمارے ہزارے کے مقبول و معروف صاحب قلم ہیں۔ ان کی غزل سے خوشی ہوئی۔ کوئی دن جاتا ہے وہ اپنی نثر بھی بھیجیں گے۔

شاعر امروز کے باب میں سید دشمر اچھے لگے:

اس کو تلاش کون و مکاں میں نہ کیجیے — جو کہہ رہا ہے شہ رگ جاں سے قریں ہوں میں — مظہر نقوی

سچ بتاؤں تو مجھے خود سے ہی شکوہ ہے — کیوں کسی بات پہ شرمندہ نہیں ہوتا میں — اسامہ خالد

"شاعر امروز کا سلسلہ خاصا دل پذیر ہے اس سے دل افروز شاعری پڑھنے کو مل رہی ہے بات وہی ہے:

محبت کی گواہی مانگتے ہیں — رقیباں کیوں تباہی مانگتے ہیں — اعجاز رضوی

لہٰذا رخصت۔ 'بیاض' کے خصوص میں امتیاز الحق امتیاز کی غزل کو سب نے پسند کیا: خیر اندیش

ممتاز راشد لاہوری

محترم اعجاز رضوی صاحب (مدیر ماہنامہ بیاض، لاہور)

آداب و تسلیمات!

ماہ رمضان کی مبارک دیتا ہوں۔ 'بیاض' (اپریل 2022) ہمدست و نظر نواز ہوا۔ خالد احمد کی صفحہ اول کی نظم "خدشہ" دعا پر ختم ہوئی اور میں نے دل سے آمین کہا۔ (مرحوم) کے اشعار اگلے کئی اوراق کی زینت تھے۔ ان میں سے کئی اشعار نے دامن دل کھینچا۔ حمد و نعت کی کاوشوں میں سے نسیم سحر، حامد یزدانی، فرحت عباس، سرور حسین نقشبندی، آصف ثاقب، جلیل عالی اور علی رضا کے کلام نے محظوظ کیا۔

گلزار بخاری کی رباعیات، محمود کیفی کے قطعات، خاور اعجاز کے ماہیے اور حامد یزدانی کے ہائیکوز نو بہ مضامین کی مہک بکھیرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ناصر علی سید نے محمود شام کی شاعری پر عمدہ مضمون لکھا۔ ڈاکٹر اختر شمار کا مضمون کلاسیکی شاعر بانی احمد پوری کے ساتھ گزری زندگی کا عکاس تھا۔ انھوں نے بانی کے عمدہ اشعار سے بھی نوازا۔

شفیق احمد خان نے فخر زمان کے اردو شعری مجموعہ "راستے کی دھول" پر عمدہ مضمون لکھا ہے۔ انھوں فخر زمان کی نظریاتی اساس اور منظم فکر کے تحت کی گئی شاعری کا خوبصورت انتخاب پیش کیا ہے۔ محمد نوید مرزا کے مضمون کا نور اختر رومانی (مرحوم) کی شاعری تھا۔ اس مضمون سے (مرحوم) کے احباب کا بھی اچھا تعارف سامنے آیا۔ روحی کنجاہی کی رحلت پر احسان فیصل کنجاہی نے یادوں سے معمور اچھا مضمون لکھا ہے۔ رومانہ رومی کا مضمون بزرگ شاعر رسا چغتائی کی شاعری پر تھا اور بلاشبہ سیراب کن مضمون تھا۔ صدام ساگر نے افسانہ نگار انتظار حسین (مرحوم) پر اپنے مضمون میں ان کی شخصیت و فن کے کئی پہلو اجاگر کیے ہیں۔ ڈاکٹر صغیر احمد صغیر کے شعری مجموعہ "مرا تو ہے" پر سیدہ آمنہ ریاض کے مضمون کی جتنی تعریف کی جائے کم ہوگی۔

شوکت علی شاہ کی "شاہ داستان" کی اس شمارے کی قسط ابوظہبی کے حکمران شیخ زید بن سلطان النہیان (مرحوم) سے ملاقات کے حوالے سے تھی۔ انھوں نے (مرحوم) کے دسترخوان کی حیران کن تفصیلات بیان کی ہیں۔ (مرحوم) نے پاکستان کے تین شہروں میں اعلیٰ معیار کے بڑے ہسپتال بنائے اور ایک ایئرپورٹ بھی۔ اللہ انھیں روح کی آسودگی بخشے۔

خیر اندیش

آفتاب احمد ملک

برادر ذی وقار عمران منظور جی!

سلام مؤدبانہ و جزاک!

رمضان المبارک کی آمد سے دوران قبل تخلیقی و ادبی تحریروں کا دلکش گلدستہ "بیاض" موصول ہوا۔ یاد آوری و آفتاب نوازی کے لیے شکر گزار ہوں

بلحاظ ترتیب حمد و نعت کے بعد برادرم سلیمان عبداللہ ذاکر کا دینی مضمون پڑھا۔ بابا واصف علی واصف اور بابا اشفاق احمد کی صوفیانہ رموز و اشارت کا تذکرہ اور سراغ زندگی پانے کے مختصر گر بھی جاننے میں دشواری نہیں ہے۔ بقول آفاقی شاعر مفسر قرآن و عاشق رسول حضرت علامہ اقبال کہ:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

شاہ داستان میں محترم شوکت علی شاہ صاحب نے شیخ زید کی آمد کا آنکھوں دیکھا حال بلکہ کیمرے کی آنکھ سے دلکش تعمیراتی منصوبہ جات کی تفصیلات پڑھ کر مورخ کی انسان دوستی کا برملا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مضمون نگار اس دورے میں قارئین کو بھی ساتھ ساتھ ہنکولے کھلاتے ہیں۔ خود نوشت کا پڑھ کر روزہ افطار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شاہ داستان آب بیتی ہے یا سفرنامہ یا ناول قلم و قرطاس کے وصلی بیورو کریٹ شاہ جی ہر ماہانہ قسط میں ہمیں اپنے مشاہدے، تجربے سے درطہ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

مضامین کے صفحات میں محمود شام کی شاعری کے حوالے سے ناصر علی سید نے تین صفحات پر مشتمل خوبصورت تجزیاتی مضمون تحریر کیا۔ کالم نگاری، سفرنامہ نگاری اور تصانیف کا بھی مختصراً ذکر کیا۔ ضرب المثل شعر کوٹ کرنا شد لازمی ہے کہ:

میں نہ ہوں گا تو یہ کالم تجزیے ہوں گے کہاں — پھر مرا واحد حوالہ شاعری رہ جائے گی — صفحہ نمبر 35

مقبول عام اور ہر دلعزیز قد آور شاعر بانی احمد پوری کی ایک غزل پر اختر شمار کا تجزیاتی مضمون بھی خوب ہے۔ گدی نشین سے ہٹ کر چہرہ غزل میں عالیت جانی اور کھنکتا رہے کہ:

ک دیا شہر میں جلتا ہے اگر تو کیا ہے — اس دیے سے تو چراغاں نہیں ہونے والا — صفحہ نمبر 39

معروف پنجابی و اردو کے شاعر و سیاستدان فخر زمان کی عمر عزیز، ادبی خدمات بلکہ ادب کی مختلف اصناف میں کامیاب تجربات سے آشکار ہے۔ سیم و تھور، مفلوج پاکستانی معاشرے میں دکھی انسانیت کو مدنظر رکھ بامعنیانہ کلام میں دل کی بات کو قلمی زبان دی:

جو بھیک ملی بانٹ دی اوروں میں اسی وقت — اور شام کو خالی مرا کشکول پڑا تھا — صفحہ نمبر 42

محمد نوید مرزا نے لاہور کی منعقدہ دو روزہ بیشوں کی میٹنگ کے نامور شاعر ان کہی کا عذاب، کے خالق تخلیق کار اختر رومانی کی شاعری کا مختصر احاطہ کیا بقول مضمون نگار کے اختر رومانی کی غزل گونج دار ہے اور اس میں ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔ (صفحہ نمبر 45)

20 سال قبل ہم سے بچھڑنے والے جی دار شاعر کا کلام ہمارا ادبی ورثہ ہے یادیں باتیں تنہائی کی ساتھی ہیں۔

خفتگانِ خاک کے حوالہ سے احسان فیصل کنجاہی نے روحی کنجاہی (مرحوم) پر تعریفی مضمون تحریر کیا۔ (مرحوم) کی تصانیف انعامات واعزازات کی تفصیل بھی درج ہے۔ بے حس معاشرے میں عمومی طور پر قلم کار دوستوں کے ساتھ آخری عمر میں یہی سلوک برتا جاتا ہے۔ کنجاہ کا درخشندہ ستارہ لاہور میں ہی دوماہ قبل غروب ہوگیا۔

رومانہ رومی صاحبہ نے رسا چغتائی صاحب کے مجموعہ کلام ''تیرے آنے کا انتظار'' کی روشنی میں تین صفحات پر مشتمل مضمون سپرد قلم کیا اور نوآموز احباب کی معلومات میں اضافہ کیا۔

صدام ساگر نے ڈونولیس مصنف افسانہ نگار، مترجم، نقاد و کالم نگار و صحافی انتظار حسین (مرحوم) 2016-1923 کی ادبی خدمات کا خوبصورت سطور میں ذکر کیا ہے۔ بقول مضمون نگار بدا لکھاری اور مختلف صداقتوں کا امین اور عرفان صدیقی کی ادبی رائے میں کہ

''ایک اور انتظار حسین کے لیے ہمیں صدیوں انتظار کرنا ہوگا۔'' (صفحہ نمبر 55)

نئی کتب پر تبصرہ جات پڑھ کر تھکاوٹ کم ہو جاتی ہے مثلاً ریاض ندیم نیازی نے ارشد ملک کے سفرنامہ ''حاضر اللہ سائیں'' خالد سعید کا افتخار شفیع کے شعری مجموعہ ''ٹیلے چاندنی رات'' پر تبصرہ سیدہ آمنہ ریاض صاحبہ کا ڈاکٹر صغیر احمد صغیر کی نئی کتاب ''مراد تو ہے'' فضیلت حسین صاحب نے ادبی جریدہ ''آثار'' پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ (صفحہ نمبر 87-82)

سات افسانوں میں معاشرتی رویوں کا رونا ہے اپنا اپنا اسلوب افسانوی نگارش ہے۔

غزل گو شعرا کی ایک اور دو غزلیات کی کل تعداد 89 ہے۔ بعض اشعار نے مسلسل اپنی لپیٹ میں رکھا۔ اختصار کے ساتھ اشعار درج ذیل ہیں:

اسیر عمر کو آیا نہ اب تک — کتاب ہجر کا عنوان رکھنا
ہوا کی طرح صحرا سے گزر جا — سفر میں کیا سر و سامان رکھنا — خالد احمد

تیری بستی میں جو انظار کا پانی ہے بیا — اب میں جاتا ہوں یہاں رات نہیں کر سکتا
اک عقیدہ ہے ازل سے جو ملا ہے ثاقب — کم کبھی عزت سادات نہیں کر سکتا — آصف ثاقب

میرے حالات میں کیا موڑ ہے آنے والا — مرے احباب مجھے چھوڑ کے جانے لگے ہیں — جلیل عالی

گردش وقت بھی چال اپنی بھلا بیٹھی ہے — کیا تیری جادو بھری شام سے ہو کر گزری — جمیل یوسف

آؤ بیٹھو، یہ فقیروں کا ٹھکانہ ہے، یہاں — ذرہ خاک بھی خورشید کیے جاتے ہیں — خادر اعجاز

اوجھل رہے کہ خاک نشین تھے نشیب میں — احباب کی نگاہ تھی اوپر لگی ہوئی — گلزار بخاری

ہم جلا لیں گے خود اپنی آنکھ میں اپنے دیے — رات کا یہ کام ہے، ہم کو جگائے اور بس — خالد علیم

آج کے انساں کے دل میں حشر برپا ہے، مگر — یہ بھی مشکل ہے سمجھنا اس کو، کس مشکل میں ہے — سید قاسم جلال

کوئی کہانی سناؤ، کہ رات کٹ جائے — کسی اداس شبستاں کا رت جگا ہوں میں — محمد انیس انصاری

خزاں میں ٹوٹتے ہیں آئینے اور زخم کھلتے ہیں — بہت مشکل ہے اس موسم میں زخموں کو رفو کرنا — اقبال مرویہ

وہاں پتنگیں اڑانے کہاں چلے راحت — کہ زندگی کے لیے بھی جہاں ہوا کم ہے — راحت سرحدی

میری یہ بات دوستو پتھر پہ ہے لکیر — مردم گزیدہ شخص ہی مردم شناس ہے — عقیل رحمانی

ایک نقطے بغیر کیا ہوں میں — دائرہ سوچتا رہا اک دن — منظور ثاقب

اسی میں دن گزرتے ہیں مگر یہ ظاہری دنیا — حقیقت ہے کہ افسانہ، نمی دانم، نمی دانم — ممتاز راشد لاہوری

عمر گزری ہے اُسے پڑھتے ہوئے — مجھ کو لگتا ہے وہ خط پائے کلارخ — جسارت خیالی

میں نے ہر لفظ مجسم دیکھا — اُس نے جب نظم سنائی میری — اوصاف شیخ

ہے چراگاہ ایک تجربہ گاہ — ایک چرواہا کیمیا داں ہے — شاہد ماکلی

ہم پرندے ہیں شکاری ہیں ہمارے رہبر — جال سازش کا بچھاتے ہیں چلے جاتے ہیں — طاہر ناصر علی

بانگ ہے توحید کی گویا اذاں — ہے تصور پنجگانہ یار کا — فیض رسول فیضان

یہ چاند تارے تم نے دکھائے تھے کس لیے — جب تم سے اک چراغ جلایا نہیں گیا — آسنا تھ کنول

روک لیتے ہیں اشک پلکوں پر — تیرے تھے رقم نہیں کرتے — عنبرین عنبر راجپوت

تجھ کو تو گردشوں نے زمیں پر گرا دیا — اور مجھ کو مشکلات نے شہین کر دیا — حیا قریشی

تمھی محبت کی ابتدا ہو، تمھی محبت کی انتہا ہو — میں عشق جو بار بار کرتی تو ایک دنیا پڑی ہوئی تھی — شفقت حیات شفق

دیسے دریا کا بھی ہوتا نہیں اندازہ کچھ — اور پتہ بھی نہیں ملتا ہمیں ساحل کا کوئی — عنبرین علی خان

نہ دے گندم کا دانہ اے زمیں دار — یہ دہقاں ہیں، کوئی مانگتے ہیں — اعجاز رضوی

نظم گو شعرا کے استعارے اور نئی بحروں میں اشعار کیا کہنے۔ شاہد ماکلی نے دونوں نوجوان شعرا کو متعارف کرایا ہے یہ کلام بھی خوب ہے۔ خطوط نگار دوستوں نے 'بیاض' کی نگارشات پر تفصیلی تبصرہ جات کیے۔ اہل قلم شاعری کی فنی خوبیوں پر مطمع نظر بیان کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صدیقی، خاور اعجاز، خورشید رہبانی، طارق بٹ، شاہد اشرف، رانا محمد شاہد، اور سعید راجہ صاحب ان کو نئی کتب کی اشاعت پر دلی مبارکباد۔ خوبصورت ہائیلائٹز دیکھ کر اور تبصرہ جات پڑھ کر ادبی تشنگی دور ہو جاتی ہے۔

ماہنامہ بیاض کے 241 صفحات پڑھ کر دانستہ طور پر مجلس ادارت کی اشاعتی معیاری کاوشوں کی داد دی جاتی ہے مختص صفحات + بروقت قارئین تک جریدہ ادب کی رسائی مقبول ادبی خدمات، دلچسپ اور یادگار 'بیاض' کی اشاعت پر دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ماہانہ تحریری ملاقات کے بعد عید النظر کی ایڈوانس مبارکباد۔

خالد احمد کا 'خدشہ' عنوان بھی دعائیہ ہے۔ فقط کمر درج ہے۔

یہی زرد زرد راتیں، یہی درد درد باتیں
یہی سرد سرد لہریں، یہی گرد گرد نہریں
مرے حال تک کسی دن، ترا حال آنہ جائے
وہی قحط پڑ نہ جائے وہی سال آنہ جائے
مری زندگی میں تجھ پر یہ زوال آنہ جائے

ناصر نقوی

محترم و مکرم۔ عمران منظور، اعجاز رضوی، نعمان منظور صاحبان

السلام و علیکم۔

مالک کائنات آپ سب کو صحت و تندرستی کے ساتھ بقید حیات رکھے تا کہ آپ ہمت و محنت سے ادبی دنیا، بیاض، کی روایت کو زیادہ استحکام دے سکیں۔

موجودہ دور بے ادب میں آپ لوگوں کی خدمات یقیناً کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں آپ نے ادب نوازی میں اپنے اور ہمارے دوست خالد احمد کو جو نئی زندگی دے رکھی ہے وہ ان کی حقیقی زندگی کے اختتام پر خاک نشینی میں بھی ان کی ہمارے درمیان موجودگی کا احساس ہر وقت دلاتی رہتی ہے دوست کی ادبی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں، انھوں نے بہت جتنا لکھا وہ اپنی جگہ منفرد اور بے مثال ہے لیکن اگر ایمانداری سے کوئی خالد احمد کو یاد کرنے کی ٹھان لے تو بہت کچھ ابھی لکھنا باقی ہے موجودہ حالات میں ادبی رسائل کا مقام ماضی سے یکسر مختلف ہے لیکن جس یکسوئی سے عمران منظور کی قیادت میں بیاض کی ٹیم اپنی ذمہ داری نبھا رہی ہے وہ خدمت بہت سی بھاری بھرکم ادبی شخصیات بھی نہیں کر سکیں "بیاض" کا بروقت شائع ہونا اس بات کا مکمل ثبوت ہے لہٰذا آپ لوگوں کو ہمت اور جذبے سے نوازے۔

ہر ماہ باقاعدگی سے بیاض ملتا ہے اسے بغور تنقیدی ذمہ داری سے پڑھتا ہوں اور ہر بار آپ لوگوں کو خراج تحسین پیش کرنے کی ٹھان لیتا ہوں لیکن غم روزگار کی غلامی میں 24 گھنٹے کم پڑ جاتے ہیں گزشتہ ماہ کے شمارے کا ٹائٹل دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ لوگوں نے ادب کے حوالے سے بہترین انتخاب کیا پھر لمحہ موجودہ میں غم زدہ ہو گیا کہ ان منفرد لوگوں کو تو ہم کھو بیٹھیں ہیں روحی کنجاہی ان میں واحد شخصیت تھے جن سے واجبی سی شناسائی تھی احترام کے رشتے میں بہت قریب نہیں ہو سکا لیکن خالد احمد، ڈاکٹر اصل نیازی اور محترمہ بشریٰ رحمان سے تو بے تکلفی تھی، خالد احمد اور بشریٰ رحمان کے ساتھ بہت کام کیا میری ٹی وی پروڈکشن کے پروگراموں کے بیٹھے ہوں، فنی ٹوپرسنٹ میں خالد احمد بطور سرپرست برابر کے شریک تھے، بشریٰ رحمان نے میرے مزاحیہ مشاعرے کی نہ صرف میزبانی کی بلکہ میں نے اپنے دوست ٹی وی پروڈیوسر عبدالعزیز کے لیے ان سے ڈرامہ سیریل بیاسی بھی لکھوایا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس مزاحیہ مشاعرے کی نظامت بشریٰ رحمان نے کی اس میں ظہیر بھٹی، انور مسعود، عمیر ابوزری، سرفراز شاہد، ڈاکٹر

انعام الحق جاوید کے ساتھ قتیل شفائی، کلیم عثمانی نے بھی اپنا مزاحیہ کلام پڑھا تھا یقیناً یہ بہت کم لوگوں کو پتہ ہوگا۔

ماہ اپریل کے شمارہ میں صدام ساگر نے دنیائے ادب کے سرخیل انتظار حسین کی یادیں تازہ کر دیں اس تحریر نے بھی مجھے اداس کر دیا کیونکہ مجھے انتظار حسین کے ساتھ برسوں کام کرنے کا اعزاز حاصل ہے کبھی کبھی سوچتا ہوں ہم کس قدر خوش قسمت ہیں کہ ہمیں احمد ندیم قاسمی، حبیب جالب، قتیل شفائی، اے حمید، شہزاد احمد شہزاد، منو بھائی، بشریٰ رحمان، خالد احمد، نجیب احمد جیسے ممتاز لکھاریوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور فیض احمد فیض، صوفی تبسم، ایوب رومانی، انجم رومانی جیسے شہرہ آفاق شعراء کو سننے کا موقع بھی ملا لیکن نظام قدرت میں دنیا میں آنے والوں کو ایک نہ ایک روز جانا ہے یہ اب ہماری مرضی کہ ہم زندوں کی قدر کریں یا چلے جانے کے بعد آنسو بہائیں یہ گوہر ادب اب تو خوابوں میں بھی ناپید ہو چکے ہیں لیکن دنیائے ادب میں اپنی کاوشوں اور تخلیقات کے ذریعے ہمیشہ جانے پہچانے جائیں گے۔ آپ کے بیاض کی معرفت شاعر امروز کا سلسلہ بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے شوکت علی شاہ صاحب کی آپ بیتی بھی خوب ہے غزلیں، نظمیں، رباعیات اور قطعات کا انتخاب بھی ہمیشہ اچھا ہوتا ہے دعا ہے کہ "بیاض" اسی طرح پھولے پھلے اور ادبی دنیا میں منفرد رہے۔ آمین میں ادب کی اس لازوال خدمت پر پوری ٹیم کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں۔

والسلام

عمران منظور:

محترم جناب ناصر نقوی!

آپ کے خط نے ہمارا ڈھیروں خون بڑھا دیا۔ آپ نے جتنے لوگوں کو یاد کیا ہے وہ سب ہمارے ادب کے معمار ہیں۔ ہم واقعی خوش قسمت ہیں کہ ان سب لوگوں سے شرف ملاقات رہی۔

جس مزاحیہ مشاعرے کی نظامت محترمہ بشریٰ رحمان نے کی وہ واقعی خاصے کی چیز ہوگا۔ اگر پی ٹی وی چاہے تو، کاش یہ مشاعرہ ہم دیکھ سکیں۔ آپ خالد احمد کے پیارے ہیں اور ہمارے لیے بھی بہت محترم ہیں۔ اپنی خوبصورت تحریروں سے ہمیں نوازتے رہا کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

طالب انصاری

برادر مکرم جناب عمران منظور صاحب

مسنون سلام اور بہت احترام

"بیاض" کا شمارہ بابت اپریل 2022 ہم دست ہوا۔ بہت نوازش

رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ شروع ہو چکا ہے اور اس مہینے میں میرے کیا سب مسلمانوں کے معمولات بدل جاتے ہیں۔ پھر بھی ادب کے مطالعے کی ایسی چاٹ لگی ہے کہ کچھ نہ کچھ وقت اس کے لیے بھی نکال ہی لیتا ہوں۔ حمد و نعت سے لے کر خطوط تک تمام رسالہ بہترین مندرجات سے بھرپور ہے۔

افسانوی گوشہ میں خواتین افسانہ نگار غالب رہیں۔ دیگر بہترین افسانوں میں دردانہ نوشین خان کا افسانہ "سٹار گرل" بہت اچھا لگا۔ افسانہ ہماری نئی نسل کے رجحانات کو ظاہر کرتا ہے۔ ان رجحانات کو ظاہر کرتا ہے۔ ان رجحانات میں دینی تعلیمات و اقدار کا کہیں دور دور تک نشان نہیں ملتا۔ آپ لاکھ سمجھائیں کہ دینی اقدار کو بھی اپنی زندگی کے معمولات میں جگہ دیں۔ نئی نسل اسے بے کار کی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہے۔ بسا اوقات آپ کی نصیحتیں، مواعظ کچھ کام نہیں کرتے۔ تخلیق کار نے افسانے کی بنت میں اسی المیے کو مرکز بنایا ہے۔ مگر ایک بے خودی کے لمحے میں جب ایک شہاب ثاقب آسمان سے ٹوٹ کر رات کی تاریکیوں میں ایک روشن سی لکیر چھوڑ کر گم ہو جاتا ہے تو سٹل جسے پے در پے کامیابیوں کی وجہ سے سٹار گرل کا خطاب مل چکا ہے کو اپنی ماں کی نصیحتیں یاد آتی ہیں۔ اسے انسان ہونے کے ناطے کائنات میں اپنی حیثیت کا ادراک ہو جاتا ہے اور وہ کھڑکی میں سر رکھ کر رو پڑتی ہے۔ اس افسانے کی خوب صورتی اس کا موضوع تو ہے ہی، اس کے ساتھ تخلیق کار نے جس فن کارانہ تخلیقیت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی داد دینا بھی واجب ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مقابلے میں سٹار گرل کو Meteor Star Prize (شہاب ثاقب تمغہ) بھی مل چکا ہے۔ اس دنیوی انعام کی بے وقعتی کا ادراک اسے ایک شہاب ثاقب کی موت ہی کرواتی ہے اور اس کے رجحانات میں مثبت تبدیلی لانے کا سبب بنتی ہے۔ شہاب ثاقب تمغہ اور آسمان میں شہاب ثاقب کے ٹوٹنے کے عمل کو ایک تلازمہ کاری کے تحت استعمال کرنا تخلیق کار کی ہنرمندانہ صلاحیت کا غماز ہے۔

آسنا تھ کنول صاحبہ کا افسانہ "ضدی" محبت کے لازوال جذبے پر بہترین افسانہ تھا۔ کہانی کا بے ساختہ بہاؤ کہیں رکنے کا نام نہیں لیتا اور اسی

بہاؤ میں قاری بہتا جاتا ہے۔ صبا ممتاز بانو نے ہمارے معاشرے میں بیشتر خاندانوں میں بہو کی بننے والی درگت کی داستان سنائی۔ اسلام عظمی، حامد یزدانی، رینو بہل اور عروج راؤ کے افسانے بھی اچھے لگے۔

شوکت علی شاہ صاحب کی آپ بیتی نہایت دلچسپ بھی ہے اور چشم کشا بھی۔ انھوں نے ڈپٹی کمشنر ہوتے ہوئے وہ کچھ مشاہدہ کیا ہے، جو عام آدمی کی نظر میں نہیں آسکتا۔ اس لیے یہ آپ بیتی معمول سے ہٹ کر ہمیں نئی دنیاؤں کی سیر کرواتی ہے۔

شعری گوشہ حسب معمول اچھا تھا۔ پسندیدہ اشعار کی فہرست طویل ہے۔ خالد احمد (مرحوم) آصف ثاقب، جمیل یوسف، خاور اعجاز، جلیل عالی، نسیم سحر، راحت سرحدی، احمد حسین مجاہد، اسحاق وردگ، محمد انیس انصاری، شفقت حیات شفق، جان کاشمیری، شاہد ماکلی، علی ارمان اور اشرف کمال کی غزلیں بہت اچھی لگیں۔

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی صاحب

السلام علیکم!

اپریل کا شمارہ ماہ رمضان کی بابرکت ساعتوں سے ایک دن قبل ملا۔ اسی مناسبت سے سرورق بھی اچھا لگا۔ کرونا کی وجہ سے گزشتہ سال لاہور میں کتاب میلہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس بار خود سے عہد کیا تھا کہ جیسے ہی ہوا ضرور جاؤں گا۔ مارچ کے دوسرے ہفتے اس کتاب میلے میں شرکت کے لیے گیا تو یہ ارادہ بھی تھا کہ 'بیاض' کے آفس بھی جاؤں گا۔ حافظ محمد عبداللہ سے اس حوالے سے بات ہوگئی تھی۔ چنانچہ اگلے روز 'بیاض' کے آفس میں تھا۔ جناب عمران منظور، جناب اعجاز رضوی اور جناب نعمان منظور بڑی محبت سے ملے۔ ظہر کی نماز کے بعد دوپہر کا کھانا انھی کے ہاں کھایا۔ عمران منظور صاحب سے ملاقات سے پہلے میں انھیں ایک سخت مزاج انسان سمجھتا تھا۔ مگر کھانے کے دوران ان کے محبت بھرے جملے اور اپنائیت کے احساس نے یہ خدشات ختم کر دیے۔ چنانچہ کھانے کے بعد ان کے ساتھ کچھ تصویریں بھی لیں۔ اعجاز رضوی صاحب کے ساتھ ان کے آفس میں کافی وقت گزرا۔ اپنی کتاب انھیں پیش کی تو انھوں نے پانچ کتابیں عنایت کر دیں۔ اعجاز صاحب سے دور حاضر کے ادب اور ادیب پر خاصی طویل گفتگو ہوئی۔ ان شاء اللہ اس گفتگو اور ملاقات کے حوالے سے الگ سے تحریر لکھوں گا۔

سلیمان عبداللہ ڈار کی روحانیت کے دروا کرتی 'سراغ زندگی' ایک بہترین تحریر تھی۔ یہ جملہ پڑھ کے پاکستان کے تمام سیاستدان یاد آگئے اور ہماری بھولی بھالی عوام بھی کہ ''کبھی الفاظ پر نہ جانا کہ انھیں ادا کرنے والی زبان تو بس اک پردہ ہے۔'' کاش قومیں یا افراد اس زبان کے پیچھے بھی دیکھ سکتے تو پتہ چلا کہ اکثر راہنما ہرن ہیں۔ مشیر، وزیر بھی چہروں پر خول لیے پھرتے ہیں۔''

ناصر علی سیّد نے محمود شام صاحب جیسے صحافت کے سرخیل کی شاعری کو موضوع بنایا۔ بعض اوقات انسان کا مضبوط حوالہ اس کی تخلیقی صلاحیت کو نگل جاتا ہے۔ باقی احمد پوری کی غزل پر اختر شمار اور فخر زمان کی غزلوں پر شفیق احمد خان کے تاثرات دلچسپ رہے۔ باقی احمد پوری کے یہ دو اشعار پسند آئے۔

شام ہوتی ہے تو ہم گھر سے نکل جاتے ہیں
اور کچھ دیر کو غم گھر سے نکل جاتے ہیں
آج کی شام نہ لوٹ کے جانا میرے ساتھ ہی رہنا
اس سے بچھڑ کر آئی ہے یہ پہلی شام پرندو

مرزا صہیب اکرام نے ''زندگی روشن بھی، تاریک بھی'' بھی زندگی کے بہت سے رنگوں کو خوبصورت پیرائے میں لکھا کیا خوبصورت بات لکھی کہ ''کہیں شادی رشتوں کے جڑنے سے زیادہ بزنس گروپ کا اشتراک ہوتی ہے، سوئٹزرلینڈ کا 15 دن کا ٹور بھی معمولی لگتا ہے اور کہیں شادی کا کل سرمایہ بعض چند مسکراہٹیں کہ ان کا تو ہنی مون بھی شادی کے بعد بازار سے چاٹ کھانا ہوتا ہے۔''

افسانوں میں اسلام عظمی کا ''حضرت صاب'' حامد یزدانی کا ''رات'' اور دردانہ نوشین خان کا ''سٹارگرل'' پسند آئے۔ دردانہ صاحبہ نے سٹارگرل میں دنیاوی کامیابی کے بعد انسان کے ساتھ جڑے نفسیاتی مسائل کو خوب اجاگر کیا ہے۔ آج کے ہر اس نوجوان کے مسائل ہیں جو کسی بھی کامیابی کو صرف اپنی صلاحیت سے جوڑتا ہے۔ حالانکہ اس کی کامیابی میں سب سے بڑا کرم اللہ کا اور پھر اس کے والدین کی دعائیں ہیں۔ شکر کی توفیق اور پیاروں کی محبت بھی انسان کو اللہ سے جڑنے سے ملتی ہے اور دراصل یہی حقیقی کامیابی ہے۔

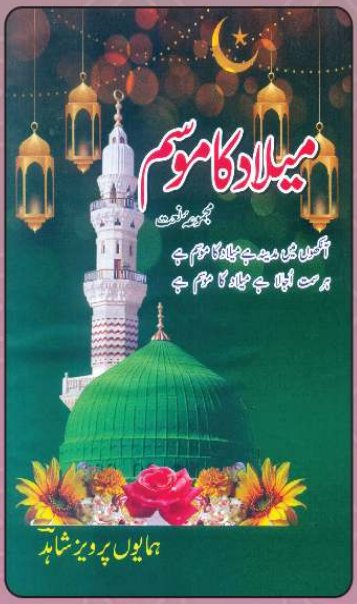
میلاد کا موسم
مجموعہ نعت
آنکھوں میں مدینے میلاد کا موسم ہے
ہر سمت اُجالا ہے میلاد کا موسم ہے
ہمایوں پرویز شاہد

عشقِ ریاضت
ڈاکٹر یاسین عاطر

سُفنے
(پنجابی شاعری)
یوسف عالمگیرین

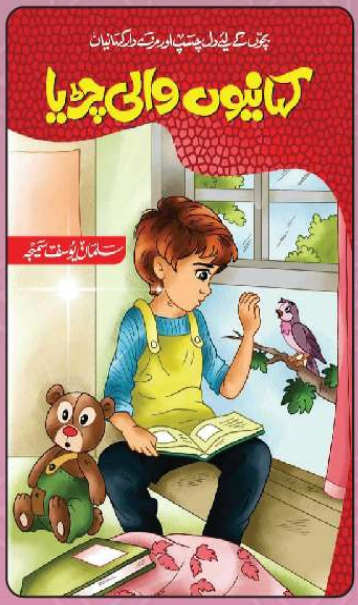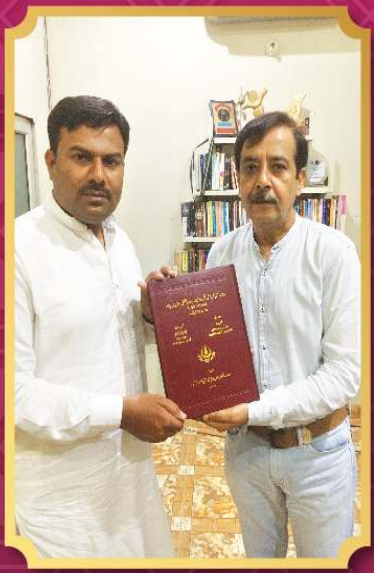
بچوں کے لیے دل چسپ اور مزے دار کہانیاں
کہانیوں والی چڑیا
سلمان یوسف سمیجہ